ترجمان القرآن لاہور

فہرست مضامین

جلد ۳۷	ربیع الاول، ربیع الثانی سنہ ۱۳۷۱ھ مطابق دسمبر ۱۹۵۱ء، جنوری سنہ ۱۹۵۲ء	عدد ۳، ۴

سید ابوالخیر مودودی پرنٹر پبلشر نے مرکنٹائل پریس چیمبرلین روڈ لاہور میں چھپوا کر دفتر

ترجمان القرآن۔ اچھرہ۔ لاہور

سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

رُودادِ اجتماع کراچی

منعقدہ ۱۰-۱۳ نومبر ۱۹۵۱ء

جماعت اسلامی پاکستان کا دوسرا کُل پاکستان اجتماع عام مرکزی مجلسِ شوریٰ کے فیصلہ کے مطابق ۱۰ تا ۱۳ نومبر ۱۹۵۱ء بروز ہفتہ، اتوار، پیر، منگل کلکری گراؤنڈ، کراچی میں منعقد ہوا۔ چونکہ انہی دنوں صوبۂ سرحد میں انتخاباتِ عام کی جدوجہد ہو رہی تھی، اس لیے حلقۂ سرحد کے ارکانِ جماعت کو اس اجتماع میں شرکت سے مستثنیٰ کر دیا گیا تھا۔ نیز مشرقی پاکستان کے ارکانِ جماعت کو شرکت کی پابندی سے اس بنا پر مستثنیٰ کر دینا پڑا تھا کہ وہاں سے آمد و رفت کے مصارف اتنے زیادہ ہیں کہ ہر شخص ان کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ البتہ وہاں سے صرف حلقۂ مشرقی پاکستان کے قیّم، مولانا عبدالرحیم صاحب تشریف لے آئے۔ ان دونوں علاقوں کو چھوڑ کر کراچی کے باہر سے تقریباً ایک ہزار کی تعداد میں ارکان اور متفقین اس اجتماع میں شریک ہوئے۔ ان سب کے قیام اور طعام کا انتظام جماعت کے زیرِ اہتمام اجتماع گاہ ہی میں کیا گیا تھا۔ اور اجتماع کے پورے ایام میں امیرِ جماعت سمیت تمام ارکان اور متفقین کا قیام مسلسل اجتماع کی قیام گاہ میں رہا۔

اجتماع کی کارروائی پروگرام کے مطابق ۱۰ نومبر مطابق ۹ صفر ۱۳۷۱ھ بروز ہفتہ بعد نماز مغرب ٹھیک چھ بجے مولانا ابوالاعلیٰ صاحب مودودی امیر جماعت اسلامی پاکستان کی افتتاحی تقریر سے شروع ہوئی۔ چار دن میں کھلے اور خاص کل سات اجلاس منعقد ہوئے اور یہ اجتماع ۱۳ نومبر بروز منگل امیرِ جماعت کی طرف سے وداعی ہدایات پر ساڑھے آٹھ بجے رات بخیر و

خوبی ختم ہوا۔ اجتماع کے عام اجلاسوں میں حاضری کم و بیش پندرہ[۱۵] سے پینتیس[۳۵] ہزار تک رہی۔ اور خاص جماعتی کارروائیوں سے متعلق اجلاسوں میں تین چار سے چھ سات ہزار تک۔ خواتین کی تعداد کا اندازہ آٹھ نو سو سے لے کر ڈیڑھ پونے دو ہزار تک ہے۔ اجتماع گاہ اور اس کے محل وقوع کے لحاظ سے تو یہ حاضری غیر متوقع حد تک زیادہ تھی، لیکن شہر کراچی کے لحاظ سے یہ اس لیے کم رہی کہ

(۱) لکڑی گراونڈ جہاں کراچی میں جماعت کو اجتماع منعقد کرنے کی اجازت ملی تھی، ایک بالکل ہی غیر معروف جگہ ہے، جس میں بجز جماعت اسلامی کے کبھی بھی کوئی قابلِ ذکر اجتماع نہیں ہوا۔ کراچی کے پرانے باشندوں، یا گراونڈ کے آس پاس رہنے والوں کے سوا بہت کم لوگ اس کے نام اور محلِ وقوع سے واقف ہیں۔

(۲) یہ گراونڈ شہر کی تعلیم یافتہ اور ذی شعور آبادی سے بہت کافی فاصلے پر واقع ہے۔ کوئی قابلِ ذکر ٹریفک بھی آس پاس سے نہیں گذرتی۔ یہاں تک کہ قریب ترین "بس روٹ" گلی در گلی راستوں سے بھی آدھ میل سے کم فاصلہ پر نہیں۔

(۳) حکومت نے جماعت اور اس کی تحریک سے ادنیٰ سی دلچسپی کا اظہار کرنے والے ملازمین کے خلاف بھی انگریزی دور کے ضوابطِ ملازمت کے تحت جو انضباطی کارروائیاں کی ہیں، انہوں نے حکومت سے خفیف سا تعلق رکھنے والے لوگوں کو بھی متوحش کر رکھا ہے۔

اجتماع کے مختلف اجلاسوں میں جو کارروائی ہوئی وہ درج ذیل ہے:

پہلا اجلاس | یہ اجلاس ۱۰ نومبر بروز ہفتہ بعد نماز مغرب ۶ سے پونے دس بجے تک ہوا۔ اجلاس کا آغاز امیر جماعت اسلامی پاکستان مولانا سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی کی افتتاحی تقریر سے ہوا۔ اس تقریر میں مولانا نے موجودہ اہم بین الاقوامی اور ملک کے خارجی اور داخلی مسائل پر تبصرہ کرتے ہوئے ان کے متعلق جماعت اسلامی کے نقطۂ نظر اور جماعت کی پالیسی کو واضح کیا۔ اس کے بعد طفیل محمد، قیم جماعت اسلامی پاکستان نے یکم مئی ۱۹۴۹ء سے ۳۱ اکتوبر ۱۹۵۱ء تک کے جماعتی کام کی رپورٹ پیش کی۔ اور تفصیل کے ساتھ بتایا کہ اس دوران میں جماعت کن کن

مراحل میں سے کس کس طرح سے گذری ہے، اس کے مختلف شعبوں نے کیا کام کیا ہے اور اس وقت جماعت کس حال میں اور کس مقام پر ہے۔

دوسرا اجلاس اجتماع کا دوسرا اجلاس ۱۱ نومبر بروز اتوار نو بجے صبح شروع ہوا۔ اس میں سب سے پہلے جناب ممتاز حسین صاحب رکن جماعت اسلامی شہر کراچی نے مولانا مسعود عالم صاحب ندوی معتمد دارالعروبہ کا مقالہ "برصغیر ہند و پاکستان میں اسلامی تحریک کی تاریخ" پڑھ کر سنایا۔ اس مختصر مقالہ میں مولانا نے ہندوستان میں اسلامی تحریک کی تاریخ کو اس خوبی کے ساتھ بیان کر دیا ہے کہ برصغیر ہند و پاکستان میں "اسلام" کی صدیوں کی تاریخ آدمی ایک نظر میں دیکھ لے سکتا ہے۔

اس کے بعد جناب فضل الرحمٰن نعیم صدیقی صاحب مدیر چراغِ راہ کراچی نے "اسلامی تحریک اور دوسری تحریکوں کے فرق" پر تقریر کی اور اس میں بتایا کہ دنیا میں اس وقت جو بڑی بڑی تحریکیں چل رہی ہیں، اُن میں اور اسلامی تحریک میں اصُول، فلسفہ اور نتائج کے لحاظ سے کیا فرق ہے۔

نعیم صاحب کی تقریر کے بعد پروگرام کے لحاظ سے مولانا امین احسن صاحب اصلاحی کی تقریر ہونی چاہیے تھی لیکن وقت کم ہونے کی وجہ سے یہ تقریر بعد کے اجلاس کے لیے موخر کر دی گئی اور اس کے بجائے سید نقی علی صاحب ناظم مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی نے مولانا مسعود عالم صاحب ندوی کا دوسرا مقالہ "دنیائے اسلام کی موجودہ اسلامی تحریکیں" پڑھ کر سنایا، جس میں مولانا نے بتایا ہے کہ اس وقت مختلف مسلم ممالک میں احیائے اسلام کی جو کوششیں ہو رہی ہیں وہ کس نوعیت کی ہیں، اور ان سے پیش نظر مقصد کے حصول کی امیدیں کس حد تک وابستہ کی جاسکتی ہیں۔

تیسرا اجلاس اجتماع کا تیسرا اجلاس ۱۱ نومبر بروز اتوار ۶ بجے شام بعد نماز مغرب شروع ہوا۔ سب سے پہلے مولانا امین احسن صاحب اصلاحی نے "ہم اس ملک میں کیا تغیرات چاہتے ہیں ہم کے

موضوع پر تقریر فرمائی جس میں اس امر کی وضاحت کرنے کے بعد کہ اس کی کیا وجہ ہے کہ ہم اسی ایک مضمون کا اعادہ بار بار کرتے رہتے ہیں اور اب پھر اس اجتماع میں اسے پبلک کے سامنے پیش کرنا چاہتے ہیں، یہ بتایا کہ اسلامی نقطۂ نظر سے اس ملک کے دستور، قوانین، نظم و نسق، نظامِ تعلیم و تربیت معاشرت اور معیشت وغیرہ میں کیا کیا تغیرات ضروری ہیں۔ اس کے بعد امیر جماعت کی "اختتامی تقریر" ہوئی۔ اس تقریر میں انہوں نے پاکستان کی موجودہ خرابیوں کے تاریخی اسباب پر مفصل تبصرہ کیا اور پھر جماعت کے اصلاحی و تعمیری لائحۂ عمل کی تشریح کی۔ آخر میں امیر جماعت نے ان سوالات کے جوابات بھی دیے جو حاضرین کی طرف سے آئے تھے۔ اور یہ اجلاس دس بجکر بیس منٹ پر ختم ہوا[1]

چوتھا اجلاس | چوتھا اجلاس ۱۲ نومبر بروز پیر صبح آٹھ بجے شروع ہوا۔ اس اجلاس میں وہ تجاویز پیش ہوئیں جو مختلف جماعتوں اور ارکان کی طرف سے آئی تھیں۔ ان میں سے جو بروقت مرکز پہنچ گئی تھیں اُن کو تو مجلس شوریٰ نے مرتب کر کے اجتماع میں پیش کرنے کے لیے مختلف ارکان شوریٰ کے سپرد کر دیا تھا۔ اور جو بعد میں وصول ہوئی تھیں وہ ان کے مجوزین ہی کے سپرد کر دی گئیں کہ وہی ان کو پیش کر دیں۔

اجلاس کے آغاز میں امیر جماعت نے اس اجلاس کی کارروائی کے لیے حسب ذیل ضابطہ کا اعلان کیا:

(۱) پہلے مجوز اپنی تجویز کو پیش کرے گا اور اگر ضرورت ہو گی تو اس کی وضاحت و تائید کے لیے تقریر کرے گا۔

(۲) اس کے بعد جو ارکانِ جماعت تجویز کے موافق یا مخالف کچھ کہنا چاہیں وہ صدرِ اجتماع (امیرِ جماعت) کی اجازت سے اپنی رائے کو پیش کریں۔ لیکن مجوز کے سوا کوئی شخص بھی پانچ منٹ سے زیادہ لینے کی کوشش نہ کرے

(۳) بلا ضرورت اور بلا نہایت بحث جاری رکھنے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ بحث کے دوران میں امیر جماعت اس بات کا اندازہ کرتا رہے گا کہ آیا دونوں طرف کا نقطۂ نظر واضح ہو گیا

---

[1] واضح رہے کہ یہ تمام تقریریں اور مقالات اس روداد کے ساتھ علیحدہ درج کیے جا رہے ہیں۔

ہے یا نہیں۔ جہاں وہ یہ محسوس کرے گا کہ بحث بلا ضرورت طویل ہو رہی ہے تو وہ اسے بند کر دیگا۔

(۴) اگر کسی تجویز پر رائے شماری کی ضرورت پیش آئی تو یہ کام امراء حلقہ کے سپرد کیا جائیگا کہ وہ اپنے اپنے حلقوں کے ارکان کی آراء شمار کر کے بتائیں کہ ان کے حلقے کی کتنی آراء موافق ہیں اور کتنی مخالف۔ خواتین ارکان کی آراء کی اطلاع قیمہ حلقۂ خواتین بھیجیں گی۔

اس کے بعد تجاویز پر کارروائی شروع ہوئی جو درج ذیل ہے:۔

تجویز ۱ بسلسلۂ ترتیب دستور جماعت اسلامی پاکستان

یہ تجویز دراصل مجلس شوریٰ کی مرتب کی ہوئی تھی جسے مولانا امین احسن صاحب نے پیش کیا۔ ان کی تقریر کا مفاد یہ تھا کہ مرکزی مجلس شوریٰ نے دستور جماعت کی ترتیب کے لیے اس سے پہلے جو یہ صورت تجویز کی تھی کہ دستوری سب کمیٹی مسودہ مرتب کر کے ارکان جماعت کے پاس بھیج دے اور پھر ارکان کی طرف سے آئی ہوئی ترمیمات پر اجتماع عام میں بحث کر کے دستور کو پاس کر دیا جائے، اب وہ اس لیے ناممکن العمل ہو گئی ہے کہ مسودہ دستور پر ارکان جماعت کی طرف سے اتنی زیادہ[1] ترمیمات آئی ہیں کہ ان کو اس اجلاس میں صرف پڑھ کر سنانے کے لیے کم از کم دو دن درکار ہوں گے۔ ترمیمات کے دو بھرے ہوئے رجسٹروں کو دیکھ کر آپ بآسانی اندازہ کر سکتے ہیں کہ ان پر یہاں اس چار سو ارکان کے ایوان میں بحث اور فیصلہ کرنے کے لیے کتنے ہفتے چاہئیں۔ اس بنا پر مجلس شوریٰ نے یہ تجویز کیا کہ دستور کے مسئلہ کو اس اجلاس عام کے سامنے پیش کرنے کے بجائے اس کی ترتیب کے لیے یہ صورت اختیار کی جائے:

(۱) ارکان جماعت بیس ارکان پر ایک نمائندہ کے حساب سے اپنے اندر سے ایک مجلس ترتیب دستور منتخب کر دیں اور

(۲) اس مجلس کو یہ اختیار دے دیں کہ وہ ان سب ترمیمات کو اور ان مزید ترمیمات کو بھی جو ارکان

---

[1] صرف مستقل ترمیمات ہی کی تعداد چھ سو سے زائد تھی اور ان کا سلسلہ دستور کی ایک ایک دفعہ پر بعض جگہ اٹھارہ اٹھارہ تک پہنچتا تھا نیز مسودہ دستور میں جو اضافے تجویز کیے گئے تھے ان کی تعداد اس کے علاوہ تھی۔

جماعت اس سلسلے میں اور بھیجنا چاہیں، سامنے رکھ کر جماعت کے لیے دستور بنائے۔

(۳) اس مجلس کا کوئی شخص بھی بربنائے عہدہ رکن نہ ہو بلکہ سب کے سب ارکان کے بلاواسطہ منتخب کردہ ہوں۔

(۴) جن حلقوں میں ارکان کی تعداد بیس سے بھی کم ہو ان کو ایک ایک نشست بہر حال دے دی جائے۔ چنانچہ اس حساب کے مطابق مجلس کے کل ارکان کی تعداد ۳۴ ہوگی اور تنظیمی حلقوں پر ان کی تقسیم اس طرح ہوگی:۔

نام حلقہ	اس حلقہ میں ارکان کی کل تعداد	تعداد نشست ہائے مجلس ترتیب دستور	نام حلقہ	اس حلقہ میں ارکان کی کل تعداد	تعداد نشست ہائے مجلس ترتیب دستور
سندھ و کراچی	۹۱	۵	لائل پور	۸۶	۴
بلوچستان	۴	۱	ملتان	۹۶	۵
ریاست بہاولپور	۶۷	۳	راولپنڈی	۵۷	۳
لاہور	۸۸	۴	سرحد	۹۶	۵
گوجرانوالہ	۶۲	۳	مشرقی پاکستان	۱۲	۱

اس تجویز کی ایک ایک شق پر بحث ہوئی اور بعض ترمیمات بھی پیش ہوئیں اور رائے شماری کی ضرورت پیش آئی۔ آخر یہ تجویز حسب ذیل اضافے کے ساتھ قبول کر لی گئی:۔

"مجلس کے ارکان کی تعداد ۳۴ سے بڑھا کر ۳۹ کر دی جائے اور ان پانچ زائد ارکانِ مجلس کو پوری جماعت کے ارکان سے غیر علاقائی بنیاد پر منتخب کرایا جائے"

تجویز ۲۔ بسلسلۂ تنظیم متفقین جماعت اسلامی پاکستان

یہ تجویز بھی مجلس شوریٰ کی طرف سے تھی اور اسے چوہدری علی احمد خاں صاحب نے پیش کیا۔ تجویز یہ تھی:۔

"آئندہ ایک سال میں کوشش کی جائے کہ جماعت کے متفقین کی تعداد کم از کم بارہ ہزار تک پہنچ

جائے اور یہ تعداد جماعت کے مختلف تنظیمی حلقے حسبِ ذیل تناسب سے پوری کریں:۔

حلقۂ لاہور	= دو ہزار	حلقۂ صوبہ سرحد	= پانچ سو
حلقۂ گوجرانوالہ	= دو ہزار	حلقۂ ریاست بہاولپور	= ایک ہزار
حلقۂ لائل پور	= دو ہزار	حلقۂ بلوچستان	= پچاس
حلقۂ ملتان	= دو ہزار	حلقۂ مشرقی پاکستان	= ایک سو
حلقۂ راولپنڈی	= ایک ہزار	حلقۂ سندھ و کراچی	= بقیہ ایک ہزار تین سو پچاس

اس تجویز کو واضح کرتے ہوئے چوہدری صاحب نے اس کے مقصد پر بھی روشنی ڈالی۔ اور اس کے بعد اس پر بھی بحث شروع ہوئی۔ بعض ارکان کی طرف سے یہ ترمیم پیش کی گئی کہ متفقین کی تعداد مقرر کرنے کے بجائے ہر حلقہ کے لیے بستیوں کی تعداد مقرر کر دی جائے جن تک دعوت پہنچانا لازم کر دیا جائے۔ لیکن حسبِ ذیل وضاحت کے بعد یہ تجویز اپنی اصل صورت میں بلا ترمیم پاس ہو گئی:۔

"بارہ ہزار کی یہ تعداد مختلف تنظیمی حلقوں کے ذمہ دار حضرات کے مشورے سے اور حلقوں کے حالات کا جائزہ لینے کے بعد مقرر کی گئی ہے۔ اگرچہ مجلس کے نزدیک یہ تعداد کم از کم ہے جو ایک سال کے اندر پوری ہو جانی چاہیے لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہیں ہے کہ محض تعداد پوری کرنے کے لیے ایسے لوگوں کو متفقین میں بھرتی کر لیا جائے جو متفقین کے لیے مقررہ شرائط کو بالفعل نہ پورا کرتے ہوں۔ اس تعداد کے تعین کا بڑا مقصد یہ ہے کہ ہر حلقہ کے کارکنوں کے سامنے ایک واضح اور متعین ہدف موجود رہے جسے نگاہ میں رکھ کر وہ سال بھر تک کام کریں۔ سال کے بعد ہم پھر مل کر بیٹھیں گے اور اگر کسی حلقہ میں کارکن اس تعداد کو پورا نہ کر پائے ہوں گے تو غور کریں گے کہ آیا اس کی وجہ ہمارے کارکنوں کی کم کوشی ہے یا اس کے اسباب کوئی دوسرے ہیں۔ دوسرے اسباب ہونگے تو ہم ان کا جائزہ لے کر دیکھیں گے کہ انہیں دور کرنے کے لیے کیا کچھ کیا جا سکتا ہے۔"

اس کے بعد یہ اجلاس سوا گیارہ بجے دوپہر برخاست ہو گیا۔

پانچواں اجلاس یہ اجلاس اسی روز (۱۲ نومبر) بعد نماز ظہر سوا دو بجے شروع ہوا۔ اس میں بقیہ تجاویز پیش ہوئیں جو درج ذیل ہیں :-

تجویز نمبر ۳ - بسلسلہ تحصیل و تقسیم زکوٰۃ -

یہ تجویز بھی مجلسِ شوریٰ ہی کی طرف سے تھی اور اسے مولانا عبدالغفار حسن صاحب نے پیش کیا تجویز یہ تھی :

" ارکانِ جماعت سے زکوٰۃ کی باقاعدہ اور باضابطہ تحصیل کا انتظام کیا جائے۔ اس طرح سے وصول شدہ زکوٰۃ کا پچیس فیصدی حصہ مرکزی بیت المال میں بھیجا جایا کرے اور باقی پچھتر فیصدی مقامی ضلعی اور حلقہ کی ضروریات کے لیے رکھا جائے "

اس تجویز کی وضاحت کرتے ہوئے مولانا نے فرمایا کہ اگرچہ ارکانِ جماعت کے لیے پہلے بھی یہ لازم ہے کہ وہ اپنی زکوٰۃ اور عشر جماعت کے بیت المال میں داخل کریں لیکن اس کی تحصیل کا جماعت کی طرف سے کوئی باقاعدہ انتظام نہیں ہے۔ تجویز کا مقصد یہ ہے کہ وہ زکوٰۃ اور عشر کی تشخیص اور تحصیل کا باقاعدہ انتظام کرے۔ اس کی تشخیص اور ادائیگی کو ارکان پر چھوڑ دینا درست نہیں ہے۔

مختصر سی بحث کے بعد یہ تجویز بالاتفاق قبول کر لی گئی۔

تجویز ۴ - لٹریچر کی توسیع اشاعت اور مکتبوں کا قیام

یہ تجویز بھی مجلسِ شوریٰ کی طرف سے آئی تھی اور اسے مولانا صدرالدین صاحب (راولپنڈی) نے پیش کیا۔ تجویز یہ تھی :-

" ایک سال کے اندر اندر ان تمام مقامات پر جماعت کے لٹریچر کے مکتبے یا ایجنسیاں قائم کر دی جائیں جہاں مختلف حلقوں کی رپورٹوں میں مکتبوں کی ضرورت ظاہر کی گئی ہے "

یہ تجویز بلا بحث منظور کر لی گئی۔

تجویز نمبر ۵ - تربیت گاہوں کے قیام کے بارے میں

یہ تجویز بھی مجلسِ شوریٰ کی طرف سے تھی۔ اسے مولانا امین احسن صاحب اصلاحی نے پیش کیا۔

تجویز یہ تھی:۔

"چونکہ ہر حلقہ میں الگ تربیت گاہ کے لیے موزوں مربّی (تربیت دینے والے) اور دوسری ضروریات مہیا کرنا مشکل ہو رہا ہے اور اسی وجہ سے مجلسِ شوریٰ کے فیصلہ کے باوجود بجز دو حلقوں کے کسی حلقہ میں بھی کوئی تربیت گاہ قائم نہیں ہو سکی اس لیے اب تجویز کیا جاتا ہے کہ ہر حلقہ میں الگ تربیت گاہ قائم کرنے کے بجائے حسب ذیل طریق پر صرف چار تربیت گاہیں قائم کی جائیں:۔

۱۔ تربیت گاہ لاہور برائے حلقہ لاہور، گوجرانوالہ و لائل پور۔

۲۔ تربیت گاہ راولپنڈی برائے حلقہ راولپنڈی و حلقہ سرحد۔

۳۔ تربیت گاہ ملتان برائے حلقہ ملتان و حلقہ بہاولپور۔

۴۔ تربیت گاہ کراچی برائے حلقہ سندھ و کراچی و بلوچستان

لاہور، راولپنڈی اور کراچی کی تربیت گاہیں سال میں صرف ایک ایک ماہ کے لیے قائم کی جائیں۔ اور ان کے مربّی (مولانا، امین احسن (اصلاحی)، اور مولانا عبدالغفار حسن صاحب ہوں اور ملتان کی تربیت گاہ کے مربّی مولانا عبدالحق صاحب (بہاول پور) اور مولانا معین الدین صاحب (ملتان)، ہوں۔ تربیت کی مدت پندرہ دن رکھی جائے۔

یہ تجویز بغیر کسی بحث و تنقید کے قبول کر لی گئی۔

تجویز ۶ ۔ آسان زبان میں ایک ہفت روزہ رسالہ کا اجراء

یہ تجویز قاضی رحمت اللہ صاحب منڈی ہیرا سنگھ ضلع منٹگمری کی تھی اور انہوں نے خود ہی اسے پیش کیا۔ اس تجویز کا خلاصہ یہ تھا:۔

وہ سوسائٹی کے کم پڑھے لکھے لوگوں اور بالخصوص دیہاتی عوام میں اسلامی فکر پھیلانے، انہیں اسلامی نظام کی ضرورت، اہمیت اور برکات سے روشناس کرنے اور اس طبقہ کے لوگوں

پرمشتمل حلقۂ متفقین کی ذہنی اور علمی تربیت کے لیے ضروری ہے کہ جماعت کے اہتمام میں ایک ایسا ہفت روزہ اخبار جاری کیا جائے جو زیادہ سے زیادہ سہل، سادہ اور عام فہم زبان میں ہو اور معمولی پڑھنے لکھنے لوگوں کے ذہنوں میں بھی اسلام اور اس کے تقاضوں کو اتارنے کی وہی قوت رکھتا ہو جو جماعت کے موجودہ لٹریچر میں اونچے تعلیم یافتہ لوگوں کے بارے میں پائی جاتی ہے،

جو اس طبقہ کے اپنے ماحول اور مسائل سے ان کی زبان میں اور ان کے نفسیات کے مطابق بحث کرے۔ مثلاً مالک و مزارع اور محنت اور سرمایہ کی کشمکش، طبقاتی نزاع، معاشی اور معاشرتی تفاوت، اس تفاوت سے پیدا شدہ اور خاندانی اور گروہی عصبیتیں، حکومت اور عوام کے معاملات اور ان کے باہم حقوق اور فرائض وغیرہ

جو ان کے سامنے موجودہ بگاڑ اور ان کے مصائب کا صحیح علاج پیش کرے، انہیں مختلف جگہ جماعتی کام کی رفتار، کارکنوں کے تجربات و مشاہدات، اور ضروری ہدایات سے آگاہ کرے جس میں ہفتہ بھر کی ضروری اور اہم ملکی اور غیر ملکی خبروں کا خلاصہ اور ان پر اسلامی نقطۂ نظر سے تبصرہ بھی ہو نیز اس میں چند صفحات عورتوں اور بچوں کے لیے خاص ہوں۔"

اس تجویز کے بارے میں امیر جماعت نے فرمایا کہ جہاں تک مرکز کا تعلق ہے اس وقت وہ کوئی پرچہ جاری نہیں کر سکتا۔ ہاں اگر کوئی حلقہ اس کام کو اپنے ذمے لے تو میں نہیں سمجھتا کہ اس سے کوئی اختلاف کرے گا۔ اس پر معلوم ہوا کہ حلقۂ لاہور کے سامنے اس طرح کے ایک رسالہ کی تجویز پہلے سے موجود ہے۔ چنانچہ طے ہوا کہ حلقۂ لاہور اس کام کو کرے اور دوسرے سب حلقوں کے لوگ اس سے اس کام میں تعاون کریں۔

اس کے بعد مولوی گلزار احمد صاحب قیم ضلع میانوالی نے ایک تجویز پیش کی لیکن تھوڑی بحث کے بعد انہوں نے اسے واپس لے لیا۔ لہٰذا اس کے ذکر کی کوئی ضرورت نہیں۔

سوالات اور جوابات

تجاویز کے بعد اُن سوالات کے جوابات دیے گئے جو بعض ارکان کی طرف سے اس لیے

آئے تھے کہ ان کا جواب برسرِ اجلاس دیا جائے۔ یہ سوالات اور ان کے جوابات درج ذیل ہیں:-

سوال ۱: حاجی بشیر احمد صاحب رکن جماعت اسلامی شہر ملتان کو کس بنا پر جماعت سے علیحدہ کیا گیا ہے درآنحالیکہ وہ خود بھی مستعفی ہو چکے تھے؟ (از جناب محمد شفیع صاحب گوجرانوالہ شہر)

جواب: اس کا جواب دیتے ہوئے قیم جماعت نے کہا کہ اول تو جب یہ تسلیم ہے کہ حاجی صاحب نے خود بھی استعفا دے دیا تھا تو پھر یہ پوچھنے کی ضرورت ہی کیا باقی رہ جاتی ہے کہ انہیں کس بنا پر جماعت سے علیحدہ کیا گیا۔ دوسرے یہ کہ حاجی صاحب خود اس اجتماع میں موجود ہیں۔ یہ ان سے معلوم کیا جا سکتا ہے کہ انہوں نے کس وجہ سے استعفا دیا تھا اور انہیں کس بنا پر جماعت سے الگ کیا گیا۔ اس طرح کے سوالات برسرِ عام پوچھنے اور ان کا جواب دینے کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا کہ خواہ مخواہ شکایتیں اور بحثیں پیدا ہوں اور ان سے طرح طرح کے فتنے اٹھیں کسی رکن کی علیحدگی کے وجوہ کو پبلک میں زیرِ بحث لانا ہم نے کبھی پسند نہیں کیا، الّا یہ کہ وہ خود اس کو پسند کریں۔

سوال ۲: اس مدت میں قیم جماعت اور امیر جماعت نے جماعت کے تنظیمی امور کی بہتری کے لیے کتنے اور کس کس علاقے کے دورے کیے؟ (جناب محمد اکرم قریشی صاحب او کاڑہ)

جواب: قیم جماعت نے کہا کہ جہاں تک امیر جماعت کا تعلق ہے انہوں نے مئی ۱۹۵۰ء سے، جبکہ وہ جیل سے رہا ہوئے، اب تک اتنے دورے کیے ہیں کہ اس سے قبل انہوں نے کبھی اتنے دورے نہ کیے تھے۔ صوبہ پنجاب کے تین ضلعوں کو چھوڑ کر کوئی ضلع ایسا نہیں ہے جس کا انہوں نے دورہ نہ کیا ہو، بلکہ بعض ضلعوں میں وہ ایک سے زیادہ مرتبہ جا چکے ہیں۔ کراچی، سندھ، بلوچستان اور سرحد کا بھی وہ دورہ کر چکے ہیں۔ البتہ قیم جماعت نے بہت کم دورہ کیا ہے اور اس کی وجہ شعبۂ تنظیم میں کارکنوں کی کمی ہے۔ اب اسے دور کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ اس کے بعد ان شاء اللہ قیم جماعت باقاعدہ دوروں کے لیے وقت نکال سکے گا۔

سوال ۳: جدید تنظیم سے پہلے ہمدردوں اور متفقین کی تعداد پاکستان بھر میں کیا تھی؟ (ایضاً)

جواب: یہ تعداد مرتب نہیں کی گئی۔ حلقوں کی رپورٹوں سے جمع کر کے ہی بتائی جا سکتی ہے۔

سوال نمبر ۴: کیا مرکزی شعبۂ تنظیم میں ضرورت کے لحاظ سے کافی کارکن ہیں؟ اگر نہیں تو کیا وجہ ہے کہ اس شعبے کے کام کو دوسرے کاموں کی نسبت کم اہمیت دی جا رہی ہے؟ (ایضاً)

جواب: سوال کے پہلے حصہ کا جواب سوال نمبر ۲ کے جواب میں آ چکا ہے۔ شعبۂ تنظیم کے کارکنوں میں کمی کی وجہ یہ نہیں ہے کہ اسے دوسرے کسی شعبہ سے کم اہمیت دی جا رہی ہے۔ بلکہ اس کی وجہ جماعت کی مالی اور بعض دوسری مجبوریاں رہی ہیں۔ ان کو مل جل کر دور کیجیے۔ پھر انشاء اللہ کوئی شکایت نہ رہے گی۔

سوال نمبر ۵: مولانا عبداللہ صاحب جہانیہ کی رکنیت سے علیحدگی کے وجوہات کیا ہیں؟ (ایضاً)

جواب: اس سوال کا جواب آپ خود مولانا ہی سے دریافت کریں۔ وہ اس اجتماع میں تشریف لائے ہوئے ہیں۔

سوال نمبر ۶: جماعتی کام کے متعلق بہت سی تجاویز بروقت عمل میں نہیں آتیں بلکہ ان کو عملی جامہ پہنانے میں غیر معمولی تاخیر بلکہ تساہل سے کام لیا جاتا ہے جس کی ایک واضح مثال دستور جدید کی تیاری ہے۔ (از حافظ غلام رسول صاحب میرپور خاص)

جواب: ان تجاویز کا حوالہ دینا چاہیے جن کو بروقت عملی جامہ نہ پہنانے کی شکایت ہے۔ جہاں تک دستور کی ترتیب کا سوال ہے، اسے جماعت کے اجتماع عام ہی میں پیش کیا جا سکتا تھا۔ اور اجتماع عام کے اب تک منعقد نہ ہو سکنے کے وجوہ سب ارکان کو معلوم ہیں۔ ان کا کوئی تعلق ہمارے تساہل سے نہیں ہے۔ البتہ دستور کا مسودہ ارکان کو بھیجنے میں ضرور دیر ہوئی ہے اور اس کی وجہ مرکزی شعبۂ تنظیم میں کارکنوں کی غیر معمولی کمی ہے۔ پورے کام کو صرف دو آدمی چلا رہے ہیں اور یہ بھی اس طرح کہ شعبۂ استفسارات کی ساری ڈاک بھی اسی شعبہ کے ذمہ ہے۔

سوال نمبر ۷: جماعت کے بعض ذمہ دار حضرات کے بیانات اشخاص پرستی کی طرف لے جانے والے ہیں۔ مثلاً مدیر چراغ راہ کا مولانا امین احسن صاحب کے "تدبر قرآن" پر تبصرہ جس میں انہوں نے مولانا کے متعلق حد سے زیادہ تعریفی جملوں کا استعمال کیا ہے۔ نیز چوہدری عبدالغنی صاحب ضلع لاہور

کا اخبار کو زریں تاثراتِ تربیت گاہ کے سلسلے میں مولانا امین احسن صاحب کے بارے میں اظہارِ خیال۔ (ایضاً)

جواب: امیر جماعت نے اس کے جواب میں کہا کہ ارکان جماعت کی دو تہائی تعداد یہاں موجود ہے اور متفقین کی ایک کثیر تعداد بھی موجود ہے، وہ شہادت دے سکتے ہیں کہ جماعت میں ایسی کوئی عام بیماری نہیں پائی جاتی جسے اشخاص پرستی سے تعبیر کیا جا سکتا ہو۔ بلکہ اس جماعت کا طرزِ عمل اپنے گرد و پیش کی سیاسی اور مذہبی جماعتوں کے بالکل برعکس ہے۔ نہ یہاں اپنے لیڈروں کے لیے کسی قسم کے القاب و خطابات استعمال کیے جاتے ہیں۔ نہ ان کے ناموں یا کارناموں کو اچھالا جاتا ہے، اور نہ ان کی تعظیم و تکریم ہی کا کوئی خاص اہتمام کیا جاتا ہے۔ اس حالت میں اگر اتفاقاً کسی شخص کا کوئی مستثنیٰ فعل آپ کو کھٹکے تو مناسب یہ ہے کہ آپ خود اسی شخص سے گفتگو یا مراسلت کریں اور اس کو اصلاح کی طرف توجہ دلائیں۔ ایسے انفرادی معاملات کو اجتماع عام میں زیرِ بحث لانا ٹھیک نہیں ہے، جب تک کہ فی الواقع ان معاملات کا کوئی عام اثر جماعت میں نہ پایا جائے۔

سوال ۵: بعض ارکانِ جماعت انگریزی بال بنوا رہے ہیں۔ ان میں سے بعض جماعت کے نمایاں عہدوں پر ممتاز ہیں۔ اہمیت رکھنے والی ذمہ داریوں کے متحمل ہیں۔ عوام اور دین دار طبقہ سے ان کا میل جول زیادہ ہے۔ ان حالات کی روشنی میں سوال یہ ہے کہ دین کو تمام گوشوں سمیت دنیا پر مسلط کرنے کی جد و جہد کرنے والے افراد گوشۂ حجامت میں کیوں دین قائم نہیں کرتے؟

(از حکیم محمد عبداللہ صاحب ضلع سرگودھا)

جواب: اس سوال کا جواب بھی امیر جماعت نے دیا۔ انہوں نے کہا کہ ہم اپنی جماعت کے ارکان کو صرف منصوص احکام کی پیروی کا پابند کر سکتے ہیں، کسی مخصوص استنباط کی پیروی کا پابند نہیں کر سکتے۔ جس طرز کے بالوں کو آپ ناجائز کہہ رہے ہیں، اگر ان کے ناجائز ہونے پر آپ کے پاس کوئی نص ہو تو وہ ضرور میرے علم میں لائیں، میں اس کے اتباع کا حکم دوں گا۔ لیکن اگر اس عدمِ جواز کو آپ نے کسی نص سے مستنبط کیا ہے، تو اپنے استنباط کی پیروی کرنا آپ ہی پر لازم ہے۔ یا پھر

اُس پر جو آپ کے استنباط کو صحیح مان لے۔ دوسرا شخص جو اس نص کے معنی آپ کے لیے ہوئے معنی سے مختلف سمجھتا ہو، اور اپنے پاس اس کے لیے دلیل رکھتا ہو، اسے نہ آپ خود مطعون کرنے کا حق رکھتے ہیں، اور نہ مجھ سے یہ مطالبہ کر سکتے ہیں کہ میں آپ کے استنباط کو ایک قانون کی حیثیت سے جماعت میں نافذ کروں۔ آپ کو یاد رکھنا چاہیے کہ جن جزئی مسائل میں ایک سے زیادہ مسلک و مذہب ہونے کی خود شریعت میں گنجائش موجود ہے۔ ان کے بارے میں تشدّد اور تنگ نظری برتنے کے نتائج اس اُمت کے حق میں بہت بُرے نکل چکے ہیں۔ اب آخر کب تک یہ سلسلہ جاری رکھا جائیگا؟

چھٹا اجلاس یہ اجلاس ۲۱ر نومبر کو بعد نماز مغرب طعام گاہ میں منعقد ہوا۔ یہ صرف ارکانِ جماعت کے لیے مخصوص تھا۔ اس کا اولین کام تنقید تھا اور اس کی غرض یہ تھی کہ جس رکنِ جماعت کو امیر جماعت سمیت جس کے خلاف بھی کوئی اعتراض یا شکایت ہو وہ اسے بیان کرے اور اس سے جواب لے تاکہ اس اجتماع سے سب لوگ بالکل صاف دل لے کر جائیں۔ سب سے پہلے امیر جماعت نے خود اپنے آپ کو پیش کیا کہ ان کی پالیسی پر یا ان کی ذات پر جس شخص کو جس حیثیت سے جو اعتراض یا شکایت ہو یا تامل بیان کرے۔ اس کے بعد دوسرے لوگوں کے معاملات بھی زیر بحث آئے۔

اس اجلاس کے دوران میں صوبہ سرحد سے ایک تار ملا جو جماعت اسلامی صوبہ سرحد کے اُس تار کا مثنیٰ تھا جو خواجہ ناظم الدین صاحب وزیر اعظم پاکستان کو دیا گیا تھا۔ اُس کا مضمون یہ تھا کہ آپ کے آزادانہ انتخابات کے وعدوں کے باوجود جماعت اسلامی کے دوسرے نامزد نمائندے ارباب نعمت اللہ خاں صاحب کو بھی گرفتار کر لیا گیا ہے۔ یہ تار سرحد کے کسی تار گھر سے نہیں بلکہ پنجاب کے شہر کیمبل پور سے دیا گیا تھا۔ اس پر کراچی پہنچنے کی تاریخ اور وقت کا اندراج نہیں تھا۔ البتہ یہ درج تھا کہ وہ کیمبل پور سے ۱۸ر نومبر کو دیا گیا۔ اس کی پشت پر حسب ذیل کارروائی انگریزی میں درج تھی:

اے۔ ایس۔ آئی/ آر

برائے کرم احکام دیجیے کہ اس بارے میں کیا کیا جائے۔ (یعنی مکتوب الیہ کو تار پہنچا دیا

جائے یا نہیں) (دستخط)

سات بجے فون پر دریافت کیا گیا۔ حکم ملا کہ دس منٹ انتظار کیجیے۔

۷½ بجے فون کیا گیا۔ جواب ملا کہ روکے رکھیے اور خود تشریف لے گئے۔

۷¾ بجے تک انتظار کیا گیا۔ (دستخط)

۸ بجے پھر فون کیا گیا مگر کوئی جواب نہ ملا۔

—— عرض کیا گیا برائے کرم ہدایت دیجیے۔

جواب ملا۔ ہاں (دستخط)

اس طرح ۱۱ نومبر کا تار ۱۲ نومبر کو رات کے تقریباً ۹ بجے مکتوب الیہ کو ملا۔ اس میں گویا صوبۂ سرحد کے "آزاد انتخابات" کی پوری تاریخ بند تھی۔ اور یہ اس بات کا کھلا ثبوت تھا کہ برسر اقتدار سیاسی پارٹی اپنے جماعتی مفاد کے لیے سرکاری محکموں کو کس طرح استعمال کر رہی ہے۔

اس کے بعد اس اجلاس میں مرکزی بیت المال کی رپورٹ اور جماعت کا بجٹ بھی پیش ہوا جسے ارکان جماعت نے منظور کیا۔ یہ اجلاس رات کو دس بجے ختم ہوا۔

حلقہ وار اجتماعات | ۱۳ نومبر بروز منگل صبح اور بعد دوپہر مختلف حلقوں اور گروپوں نے اپنے اپنے الگ الگ اجتماعات کئے تاکہ جماعت کے آئندہ پروگرام کے مطابق یہیں سے اپنے اپنے لیے کام کا نقشہ بنا کر روانہ ہوں۔ تعلیم کسانوں اور مزدوروں کے کام سے دلچسپی رکھنے والے لوگوں نے بھی باہم مل کر اپنے اپنے مسائل پر غور کیا۔

ساتواں اجلاس | اسی روز شام کے چھ بجے اس اجتماع کا آخری اجلاس منعقد ہوا جس میں امیر جماعت نے اپنی وداعی ہدایات ایک تقریر کی صورت میں ارشاد فرمائیں یہ تقریر سوا دو گھنٹے جاری رہی۔ اس کے بعد اجتماع ختم ہوگیا۔

نمائش | اس اجتماع کی خاص قابل ذکر چیزوں میں سے ایک "نمائش" بھی تھی جس میں نقشوں، چارٹوں اور کتبوں کے ذریعہ سے جماعت کی موجودہ طاقت، کیفیت اور تنظیم کو، اس کی دعوت اور اس کی تاریخ کو اور ان مختلف مراحل کو جن سے جماعت اب تک گذری ہے دکھایا گیا تھا۔ اس کے علاوہ جماعت کے لٹریچر اور اسکے اپنے اور دوسرے ہم خیال رسائل اور اخبارات کی بھی نمائش کی گئی تھی۔ وہ تمام قابل ذکر لٹریچر بھی اس میں فراہم کیا گیا تھا جو تحریک اسلامی کے زیر اثر دوسرے دارالاشاعتوں اور مکتبوں نے شائع کیا ہے۔

اجتماعِ کراچی کی افتتاحی تقریر

[یہ وہ تقریر ہے جو ۱۰ نومبر کو جماعتِ اسلامی کے اجتماعِ عام کا افتتاح کرتے ہوئے کراچی میں کی گئی تھی]

حمد و ثنا کے بعد:-

رفقائے جماعت و برادران دین! کئی سال کے بعد آج مجھے یہ موقع نصیب ہوا ہے کہ اپنی جماعت کے تمام رفقاء کو بیک وقت خطاب کر سکوں۔ ۱۹۴۶ء میں جماعت کا اجتماعِ عام الٰہ آباد میں ہوا تھا جبکہ ملک ابھی تقسیم نہ ہوا تھا۔ اس وقت سارے ہندوستان (مع پاکستان) کے رفقا جمع ہوئے تھے۔ مگر میں اپنی بیماری کی وجہ سے اجتماع کی کارروائی میں حصہ نہ لے سکا۔ پھر ۱۹۴۹ء میں پاکستان کی جماعت کا اجتماعِ عام لاہور میں منعقد ہوا۔ مگر میں آپ کے درمیان موجود نہ تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ آج برسوں بعد آپ کا یہ مجمع میری موجودگی میں اکٹھا ہوا ہے اور میں اسے خطاب کر رہا ہوں۔ دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ اس اجتماع کو ہمارے لئے مبارک بنائے اور ہم سے اپنے دین کے قیام و اعلاء کی خدمت لے۔

یہ بھی خوشی کی بات ہے کہ ہمارا یہ اجتماع پاکستان کے دارالسلطنت میں منعقد ہو رہا ہے، جو اس ملک میں جغرافی طور پر نہ سہی، معنوی حیثیت سے ضرور مرکزی مقام ہے۔ یہاں پورے ملک کے اہل دماغ کا مجموعہ موجود ہے۔ یہاں کی آبادی پورے ملک میں سب سے زیادہ تعلیم یافتہ اور سب سے بڑھ کر ذی شعور ہے۔ اور خدا کرے کہ سب سے بڑھ کر بیدار بھی ہو۔

اس مرکزی مقام پر، اس کی اہمیت کو ملحوظ رکھتے ہوئے میں ضروری سمجھتا ہوں کہ اپنی اس تقریر میں بیرونِ ملک اور اندرونِ ملک کے تمام اہم مسائل پر اظہارِ رائے کروں۔ اور ملک کے داخلی حالات پر تبصرہ کرنے کے ساتھ یہ بھی بتاؤں کہ ان حالات کی اصلاح کے لئے ہمارے پاس کیا پروگرام ہے۔ اس

موقع پر جو کچھ میں عرض کروں گا وہ محض میری ذاتی رائے ہی نہ ہوگی، بلکہ جماعت اسلامی کے نقطۂ نظر اور پالیسی اور پروگرام کی توضیح ہوگی۔

لیاقت علی خاں مرحوم کا قتل

کسی دوسرے مسئلے پر گفتگو کرنے سے پہلے میں اُس حادثۂ عظیم پر اپنے اور اپنی جماعت کے دلی رنج و افسوس کا اظہار کرتا ہوں جو ابھی پچھلے ہی مہینے ہمارے ملک میں رونما ہوا ہے یعنی مسٹر لیاقت علی خاں مرحوم کا قتل۔ یہ واقعہ نہ صرف شخصی حیثیت سے دردناک ہے، نہ صرف اخلاقی حیثیت سے شرمناک ہے، بلکہ اس لحاظ سے پورے ملک کے لئے افسوسناک بھی ہے کہ ایک نہایت نازک موقع پر، جبکہ ہمارا ملک خطرات سے گھرا ہوا ہے، ایک ایسا شخص ہمارے درمیان سے زبردستی ہٹا دیا گیا جو یہاں کے معاملات کی سربراہ کاری کا سارا بوجھ اٹھائے ہوئے تھا جس سے زیادہ با اثر اور ذمہ دار شخصیت ہمارے یہاں موجود نہ تھی۔ ان سارے اختلافات کے باوجود جو ہمیں ان کی پالیسی اور طریق کار سے تھے، ہم اس بات کے معترف ہیں کہ انہوں نے بڑے نازک زمانے میں اس ملک کے نظم و نسق کی ذمہ داری سنبھالی اور اپنی قابلیت کے مطابق اس نوزائیدہ مملکت کو مضبوط بنیادوں پر قائم کرنے کی پوری کوشش کی۔ اس کارِ عظیم میں ان کی محنت و جانفشانی کا اعتراف ہر وہ شخص کرے گا جس نے پچھلے سوا چار سال کی مشکلات کو دیکھا ہے۔

پھر یہ واقعہ اس لحاظ سے خطرناک بھی ہے کہ یہ اس ملک میں ایک بہت بُرے رجحان کے ابھرنے کی علامت ہے۔ اگرچہ سردست یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس حرکت کا محرک کیا تھا۔ کوئی سیاسی محرک تھا یا شخصی ـــــ لیکن اگر فی الواقع وہ کوئی سیاسی محرک تھا تو یقیناً یہ حالات کو ایک ایسے رُخ کی طرف موڑنے والی حرکت ہے جس کی ہر اُس شخص کو مذمت کرنی چاہیے جو اس ملک اور اس ملت کی فلاح چاہتا ہو۔ کسی ملک کے لیے اس سے بڑھ کر اور کوئی بدقسمتی نہیں ہو سکتی کہ اس میں فیصلے کا آخری اختیار عقل و شعور، دلیل اور رائے عام سے چھین کر قاضیٔ شمشیر کے سپرد کر دیا جائے۔ یہ

قاضی کوئی عادل اور صاحبِ فکر قاضی نہیں ہے۔ یہ اندھا، بہرا اور گونگا قاضی ہے۔ اس سے جب کبھی فیصلہ چاہا گیا ہے۔ اس نے حق اور انصاف دیکھ کر نہیں بلکہ خون کی رشوت لیکر فیصلہ کیا ہے۔ اور جس نے بھی زیادہ خون چڑھا دیا ہے اُسی کے حق میں اس نے فیصلہ دے دیا ہے خواہ وہ حق پر ہو یا ناحق پر، خواہ وہ نیک ہو یا بد۔ کوئی قوم جو خود اپنی دشمن نہ ہو اور جس کی عقل کا دیوالہ نہ نکل چکا ہو ایسی بیوقوف نہیں ہو سکتی کہ اپنے معاملات کا فیصلہ شعور و استدلال کے بجائے تلوار کے اندھے اور رشوت خوار قاضی کے حوالہ کر دے۔ اگر ہم اپنا مستقبل تاریک نہیں کرنا چاہتے تو ہمیں پوری طاقت کے ساتھ اپنے ملک کے حالات کو اِس خطرناک رُخ پر جانے سے روکنا چاہیئے۔

اس کے ساتھ یہ اندوہناک واقعہ ہم سب کے لیے اپنے اندر ایک اخلاقی سبق بھی رکھتا ہے۔ اس سے پہلے ہم سُن چکے ہیں کہ ہمارے ملک میں ایک سازش ہوئی تھی جس کا مقصد فوجی طاقت سے سیاسی انقلاب برپا کرنا تھا۔ اور اب ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا ہے کہ ہمارے سب سے بڑے ذمہ دار سیاسی لیڈر کو علی الاعلان قتل کر دیا گیا۔ ہمیں واقعات کی اس منطق کو سمجھنا چاہیے۔ یہ واقعات ہمیں ایک تنبیہ کر رہے ہیں۔ اُس تنبیہ کو غفلت سے نظر انداز کر دینا مناسب نہیں ہے۔ ہمیں اور خصوصاً ہمارے ذمہ دار لوگوں کو یہاں ایسے حالات پیدا کرنے اور قائم رکھنے کی پوری کوشش کرنی چاہیے جن میں ہر وہ سیاسی تغیر پُرامن طریقے سے ہو سکتا ہو جس کے حق میں رائے عام ہموار ہو جائے، اور کوئی ایسی وجہ باقی نہ رہے جس کی وجہ سے لوگ یہ سوچنے لگیں کہ قومی اور سیاسی معاملات کا فیصلہ مصنوعی اور جبری تدابیر اختیار کیے بغیر نہیں ہو سکتا۔ اگرچہ برطانیہ ایک غیر مسلم ملک ہے، مگر حکمت بہرحال مومن کی کھوئی ہوئی متاع ہے جہاں سے بھی یہ ملے اسے لینا چاہیے۔ ہمارے لیے برطانوی قوم کے طرزِ عمل میں ایک سبق موجود ہے جس سے ہم فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ وہاں کوئی فوجی یا غیر فوجی سازش نہیں ہوتی۔ کوئی خفیہ تحریک نہیں اٹھتی۔ کوئی انگریز، خواہ وہ ملک کے رائج الوقت نظام سے کتنا ہی سخت اختلاف رکھتا ہو، کبھی یہ سوچنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا کہ اسے اپنے ملک کے کسی لیڈر یا حکمراں کو قتل کر دینا چاہیے۔ بڑے سے بڑے انقلابی خیالات رکھنے

والے آدمی کے ذہن میں بھی وہاں یہ تخیل راہ نہیں پاتا کہ جس انقلاب کا وہ خواہش مند ہے اسے برپا کرنے کے لیے فلاں شخص یا فلاں اشخاص کو قتل کر دینا مفید یا ناگزیر ہے۔ غور کیجیے کہ اس کا سبب کیا ہے؟ درحقیقت یہ سب کچھ اس بات کا ثمرہ ہے کہ وہاں ایسے حالات پیدا کیے گئے ہیں جن میں ہر شخص اپنے نظریے اور پروگرام کے حق میں رائے عام کو ہموار کرنے کی کوشش کر سکتا ہے، اور ہر شخص کو پورا اطمینان ہے کہ جب بھی وہ رائے عام کو ہموار کرے گا، ملک کا نظام اس کے منشا کے مطابق بدل جائیگا۔ وہاں اگر کسی کی بات نہیں چلتی تو اس لیے نہیں کہ کسی نے طاقت سے اس کا راستہ روک رکھا ہے، بلکہ صرف اس لیے کہ رائے عام اس کے حق میں نہیں ہے۔ یہ چیز اس کو پستول چلانے کے بجائے اپنی بات کو پھیلانے اور عوام کو اپنے دلائل سے مطمئن کرنے پر آمادہ کرتی ہے۔ اسے کبھی یہ اندیشہ نہیں ہوتا کہ وہ اُن ذرائع سے محروم کر دیا جائے گا جن سے وہ اپنے حق میں رائے عام کو ہموار کر سکتا ہو۔ اور اس کو کبھی یہ خطرہ بھی لاحق نہیں ہوتا کہ انتخابات میں کوئی با اختیار شخص یا گروہ اپنے اختیارات سے ناجائز فائدہ اٹھا کر رائے عام کے بالکل برعکس نتائج حاصل کرے گا۔ یہی چیز ہے جس کی بدولت برطانیہ میں ہر تغیر بالکل پُرامن اور معقول طریقے سے ہو جاتا ہے، اور باشندگانِ ملک میں جبری انقلاب یا سیاسی قتل و خون کا رجحان پیدا ہونے ہی نہیں پاتا۔ ہم چاہتے ہیں کہ ایسی ہی حالت ہمارے ملک کی بھی ہو جائے اور یہاں اُن اسباب کی جڑ کاٹ دی جائے جو سازشوں اور خفیہ تحریکوں اور مجرمانہ اقدامات کے محرک بنتے ہیں۔

خارجی مسائل

اب میں سب سے پہلے خارجی مسائل کا ——— اُن خارجی مسائل کا جو ہمارے لیے کسی نہ کسی حیثیت سے دلچسپی کے موجب ہیں ——— ایک مختصر جائزہ لونگا۔

مصر، ایران اور شمالی افریقہ ہمیں ہر حیثیت سے قریب ترین دلچسپی جس معاملہ میں ہے وہ اُن مسلم ممالک کا معاملہ ہے جن سے اس وقت مغرب کی جابر طاقتوں کی کشمکش چل رہی ہے۔ ایران،

مصر، شمالی افریقہ، یہ وہ ممالک ہیں جن پر ایک مدت دراز سے انگلستان اور فرانس دست درازی کرتے رہے ہیں، اور اب یہ اپنے نقصانات کی تلافی اور اپنے کھوئے ہوئے حقوق کی واپسی کے لیے کوشاں ہیں پچھلی جنگِ عظیم کی برکات میں سے ایک برکت یہ ہے کہ اُن ظالم قوموں کا زور ٹوٹ گیا ہے جو دنیا بھر کے لیے بلائے بے درماں بنی ہوئی تھیں۔ جن کی سلطنت میں سورج غروب نہ ہوتا تھا، اب ان میں وہ غروب ہونے لگا ہے۔ جو سمندر کی لہروں پر حکمرانی کر رہے تھے، اب ان کے چنگل سے لہریں آزاد ہو رہی ہیں۔ مغلوب اور مظلوم ملکوں کو اب یہ موقع مل گیا ہے کہ جس گرفت میں وہ جکڑے ہوئے تھے اس سے نکلیں اور جو کچھ ناروا طریقے پر اُن سے لیا گیا تھا اسے واپس لیں۔ لیکن ظالم طاقتیں کمزور ہو جانے کے باوجود ابھی تک ہر اُس چیز کو دانتوں سے پکڑے ہوئے ہیں جو اپنے زور کے زمانے میں انہوں نے کمزوروں سے چھینی تھی۔ اس طرح مشرق سے لیکر مغرب تک ایک کشمکش برپا ہو گئی ہے۔

اس معاملہ میں ہماری ساری ہمدردیاں اُن ملکوں کے ساتھ ہیں جو اپنے جائز حقوق کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں۔ ان کے ساتھ ہماری ہمدردی صرف اسی بنیاد پر نہیں ہے کہ وہ مسلمان ہیں، بلکہ اس بنیاد پر بھی ہے کہ وہ مظلوم ہیں، حق ان کے ساتھ ہے، اور اُن کے حریف سراسر ناحق پر ہیں۔ ہماری دلی خواہش یہ ہے کہ اس دنیا سے ظلم مٹے اور انصاف کا بول بالا ہو۔

اس سلسلہ میں ایک اہم سوال بھی ہے جسے میں اس موقع پر صاف کر دینا چاہتا ہوں۔ میں نے بہت سے لوگوں کے دلوں میں یہ کھٹک پائی ہے، اور انگریزی پریس نے اس کو اُبھارنے کی کوشش کی ہے کہ ایران اور مصر، دونوں نے اپنے اپنے معاہدات کی یک طرفہ تنسیخ کر دی ہے، حالانکہ معاہدے کا دوسرا فریق اس پر راضی نہ تھا۔ وہ کہتے ہیں کہ اس طرح کسی معاہدے کو ایک فریق فسخ کرنے کا کیسے مجاز ہو سکتا ہے؟ یہ ایک اخلاقی سوال ہے جسے وہ لوگ تو نظر انداز کر سکتے ہیں جن کے نزدیک اصل اہمیت صرف قومی مفاد کی ہے اور جن کی رائے میں قومی مفاد کا اگر تقاضا ہو تو اس پر ہر اخلاقی اصول قربان کیا جا سکتا ہے۔ لیکن ہم اسے کسی طرح نظر انداز نہیں

کر سکتے، کیونکہ ہمارے نزدیک اخلاق ہر چیز پر مقدم ہے اور فائدہ ہو یا نقصان، ہر صورت میں اخلاقی اصولوں کی پابندی ہونی چاہیے۔ اس لیے میں اس سوال کا یہاں جواب دینا چاہتا ہوں تاکہ جن لوگوں کے دلوں میں اس معاملے کے متعلق کھٹک موجود ہے ان کی کھٹک بھی دور ہو جائے اور ہمارے متعلق بھی کسی کو یہ غلط فہمی نہ ہو کہ ہم نے اخلاق کے سوال کو نظر انداز کر کے کسی بے جا حمیت کی بنا پر اس معاملہ میں مصر و ایران کی حمایت کی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اصول اخلاق کے لحاظ سے بہت بڑا فرق ہے اُن معاہدات میں جو دو فریق اپنی آزاد مرضی اور مساویانہ طریقہ سے باہم طے کریں، اور اُن معاہدات میں جو ایک فریق کی کمزوری یا مجبوری سے ناجائز فائدہ اٹھا کر دوسرا فریق حاصل کرے۔ اخلاق کی نگاہ میں یہ دو الگ الگ نوعیتوں کے معاہدے ہیں اور ان دونوں کا حکم ہرگز یکساں نہیں ہو سکتا۔ جو معاہدے فریقین کی آزادانہ رضامندی سے مساویانہ طریقے پر طے ہوئے ہوں وہ یقیناً وزنی اور قیمتی معاہدے ہیں، ان کی پوری پوری پابندی ہونی چاہیے، ان کی خلاف ورزی حرام ہے، ان میں کسی قسم کے ردوبدل کا ایک فریق کو حق نہیں پہنچتا۔ لیکن جو معاہدہ فریقین کی آزادانہ رضامندی سے مساویانہ طریقے پر طے نہ ہوا ہو، بلکہ جس کو ایک فریق نے اپنے زور سے حاصل کیا ہو اور دوسرے نے اپنی کمزوری یا مجبوری کی بنا پر مانا ہو، وہ اخلاقی حیثیت سے کوئی وزن اور قیمت نہیں رکھتا۔ اس کا قیام و بقا اخلاق پر نہیں بلکہ فریقین کے حالات پر منحصر ہے۔ جب تک وہ حالات باقی رہیں جن میں اس نوعیت کا معاہدہ ہوا تھا، صرف اسی وقت تک ایسا معاہدہ نافذ العمل رہ سکتا ہے۔ اور جب حالات بدل جائیں، جب ظالم کا زور ٹوٹ جائے اور مظلوم کی کمزوری یا مجبوری باقی نہ رہے، ایسے معاہدے کو آپ سے آپ ٹوٹ جانا چاہیے۔ زیادہ سے زیادہ جو اخلاقی ذمہ داری مظلوم فریق پر عائد ہوتی ہے وہ صرف یہ ہے کہ حالات بدل جانے پر وہ پہلے ظالم فریق کو معاہدے پر نظر ثانی کرنے کی دعوت دے۔ لیکن اگر اس کے دعوت دینے کے باوجود ظالم فریق نہ مانے تو مظلوم فریق کو پورا حق پہنچتا ہے کہ اس کا معاہدہ اس کے منہ پر مار دے، یا

معاہدے میں انصاف کے مطابق مناسب ترمیم کر دے۔

یہ جو کچھ عرض کر رہا ہوں یہ کوئی میرا من گھڑت اخلاقی اصول نہیں ہے، بلکہ شریعتِ اسلامی میں اس کی بنیاد موجود ہے۔ اسلامی قانون سود کے معاہدے کو تسلیم نہیں کرتا، کیونکہ اس میں ایک فریق اپنی برتر مالی پوزیشن کی بنا پر سود کی شرط عائد کرتا ہے اور دوسرا فریق اپنی مالی کمزوری اور اپنے حالات کی مجبوری سے اس شرط کو قبول کرتا ہے۔ اسی طرح اسلامی قانون بیعِ مضطر کو بھی تسلیم نہیں کرتا، کیونکہ اس میں ایک فریق دوسرے کو پریشان حال دیکھ کر اس کی ۱۰۰ روپے مالیت کی چیز کے پانچ روپے دام لگاتا ہے، اور دوسرا فریق اپنی مصیبت سے مجبور ہو کر ان داموں اپنی چیز بیچ دیتا ہے۔ یہ اصول صرف شخصی معاملات تک ہی محدود نہیں ہے، بلکہ بین الاقوامی معاملات میں بھی اس کی نظیریں موجود ہیں۔ مثال کے طور پر صلح حدیبیہ کے معاہدے کو لیجیے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور کفار مکہ کے درمیان طے ہوا تھا۔ اس معاہدے میں من جملہ دوسری شرائط کے ایک شرط یہ بھی تھی کہ مدینے سے جو لوگ بھاگ کر مکہ جائیں گے انہیں تو کفار مکہ واپس نہ کریں گے، مگر مکہ سے جو لوگ بھاگ کر مدینے جائیں گے انہیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم واپس کر دیں گے۔ یہ صریح طور پر ایک غیر معقول اور غیر منصفانہ شرط تھی جو کفار مکہ کے اصرار پر مانی گئی تھی۔ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف اس مجبوری سے اس کو قبول کیا تھا کہ کفار مکہ اس کے بغیر آپ کو اور مسلمانوں کو زیارتِ کعبہ کا حق دینے کے لیے تیار نہ تھے، حالانکہ عرب کے قدیم ترین مسلّمہ قاعدے کے مطابق نہ حرم کعبہ اہل مکہ کی جائداد تھا اور نہ انہیں کسی کو اس کی زیارت سے روکنے کا، یا اس پر کوئی شرط عائد کرنے کا حق تھا۔ اس لیے ان کی یہ شرط قطعی غیر منصفانہ تھی اور ایک صاحبِ حق کی مجبوری سے بالکل ناجائز فائدہ اٹھا کر منوائی گئی تھی۔ اب دیکھیے کہ قرآن اس شرط کے ساتھ کیا معاملہ کرتا ہے۔ جہاں تک مردوں کا تعلق تھا، قرآن نے اس کو باقی رہنے دیا۔ مگر جب کچھ عورتیں مکہ سے ہجرت کر کے مدینے آئیں اور کفار مکہ نے ان کی واپسی کا مطالبہ کیا، تو قرآن میں صاف حکم آ گیا کہ ان عورتوں کو واپس نہ کیا جائے۔ یہ صریح طور پر بین الاقوامی معاہدے کی یک طرفہ ترمیم تھی

اور اس کے جواز کی اس کے سوا اور کوئی بنیاد نہ تھی کہ جس معاہدے کو ایک فریق نے دوسرے فریق کی مجبوری سے ناجائز فائدہ اٹھا کر تسلیم کرایا ہو اس کی اخلاقی حیثیت ہرگز وہ نہیں ہے جو فریقین کی مساویانہ اور آزادانہ مرضی سے طے کیے ہوئے معاہدوں کی ہوتی ہے۔ اس طرح کے ایک معاہدے میں مظلوم فریق کو حق پہنچتا ہے کہ اگر پورا معاہدہ ظالمانہ ہو تو موقع پاکر اسے ظالم کے منہ پر مار دے، اور اگر معاہدے کی کچھ شرطیں ناقابل برداشت ہوں تو انصاف کو ملحوظ رکھ کر ان میں مناسب ترمیم کر دے۔ یہ ایک مستقل اصول ہے جو قرآن کے اس فیصلے سے مستنبط ہوتا ہے۔

پس ہم اس معاملہ میں بالکل مطمئن ہیں کہ ایران اور مصر نے معاہدات کی یک طرفہ تنسیخ کا جو اقدام کیا ہے وہ بالکل درست ہے۔ یہ معاہدے ظالمانہ تھے اور اسی قابل تھے کہ انہیں فسخ کر دیا جائے۔

شمالی افریقہ، مصر، ایران اور دوسرے تمام مسلم ممالک میں برطانیہ، امریکہ اور فرانس نے جو پالیسی اختیار کر رکھی ہے اس سے ہم کو یہ قوی اندیشہ ہے کہ اگر اس کا سلسلہ اسی طرح چلتا رہا تو آخرکار یہ پالیسی ان تمام ملکوں کو کمیونزم کی طرف دھکیل دیگی اور اس کے نتائج ساری دنیا کے لیے بھی خطرناک ہونگے اور خود ان مسلمان ملکوں کے لیے بھی۔ خدا کرے کہ ان ظالم قوموں کی آنکھیں کھل جائیں اور انہیں جلدی محسوس ہو جائے کہ اس نازک موقعہ پر یہ کیسی سخت غلطی کر رہی ہیں۔ اگر مسلمان ملک اپنے حق کے سوا کچھ اور مانگ رہے ہوتے تو البتہ یہ ایک بجا بات ہوتی اور اسے رد کر دینے میں مغربی قومیں حق بجانب ہوتیں۔ لیکن یہاں تو معاملہ ہی دوسرا ہے۔ حق والے اپنا حق مانگتے ہیں اور اسے طاقت کے بل پر ٹھکرایا جاتا ہے۔ اپنی جہانگیرانہ اغراض کے لیے نت نئی پالیسیاں بنائی جاتی ہیں اور زبردستی ان کو دوسروں پر ٹھونسا جاتا ہے۔ عرب ملکوں کے سینے میں اسرائیل کا خنجر بھونکا جاتا ہے۔ سویز کے راستے پر قابض رہنے کے لیے اصرار کیا جاتا ہے۔ ایران کے پٹرول کو چھوڑنے سے انکار کیا جاتا ہے۔ الجیریا، مراکش اور ٹیونس پر فرانس بدستور اپنا قبضہ جمائے رکھنا چاہتا ہے۔ ان حرکات کو آخر کون جائز ثابت کر سکتا ہے؟

ان پر اصرار کرنے کے معنی اس کے سوا اور کیا ہیں کہ آپ ان ملکوں کو زبردستی دھکیل دھکیل کر روس کی گود میں پھینکنا چاہتے ہیں۔ جس رفتار سے ان ملکوں میں کمیونزم کا زور بڑھ رہا ہے اسے دیکھتے ہوئے ہم یہ سمجھتے ہیں کہ جب تک امریکہ اور انگلستان کی ظالمانہ پالیسی نہ بدلے گی مسلمانوں کی کمیونزم سے طبعی بیزاری اور مسلم ممالک کی اسلامی تحریکات کے باوجود اس سیلاب کو نہ روکا جاسکے گا۔ پس یہ وقت ہے کہ امریکہ اور انگلستان ہوش میں آئیں اور اپنا رویہ بدلیں۔ حکومت پاکستان سے ہم یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ ان دونوں سلطنتوں کو اُن کی موجودہ پالیسی کے خطرناک نتائج پر صاف صاف متنبہ کرے اور انہیں اس سے باز آنے کا مشورہ دے۔ ہمارے محکمۂ خارجہ کو انہیں سمجھانا چاہیے کہ تم اب زیادہ مدت تک مسلم ممالک کے سینے پر مونگ نہیں دل سکتے۔ اب تمہیں دو راستوں میں سے ایک کو لامحالہ انتخاب کرنا ہوگا۔ ایک راستہ یہ ہے کہ تم ان ملکوں کو راضی اور مطمئن کر کے ان کا دوستانہ تعاون حاصل کرو۔ دوسرا راستہ یہ ہے کہ ان کو تنگ کر کر کے کمیونزم اور روس کی طرف دھکیل دو۔ تم خود ہی موازنہ کر کے دیکھ لو کہ ان دونوں میں سے کونسا راستہ تمہارے لئے بہتر ہے۔

مسلم ممالک کے سلسلے میں ایک اور بات بھی ہے جس کے متعلق میں جماعت اسلامی کے نقطۂ نظر کو واضح کر دینا چاہتا ہوں۔ خدا کے فضل سے اس وقت ان ملکوں میں متعدد ایسی تحریکیں چل رہی ہیں جن کا مقصد اسلام کا احیاء اور اسلامی نظامِ زندگی کی تجدید و ترویج ہے۔ ہم ایسی تمام تحریکات سے دلی ہمدردی رکھتے ہیں، سچے دل سے ان کی کامیابی کے خواہشمند ہیں، اور ہر اس تعاون کے لئے تیار ہیں جو ہمارے اور ان کے لئے ممکن ہو۔ اسی طرح ہم ان سے بھی یہ چاہتے ہیں کہ اللہ کے راستے میں وہ ہمارے ہمدرد اور مددگار بنیں۔ بخلاف اس کے ان ملکوں میں جتنی تحریکیں قوم پرستی پر مبنی ہیں، یا جن کا مقصد مغربی افکار و اطوار اور غیر اسلامی تہذیب و تمدن کو فروغ دینا ہے، ہم ان کے اسی طرح مخالف ہیں جس طرح خود اپنے ملک کی ایسی تحریکات کے مخالف ہیں۔

روس اور اینگلو امریکن بلاک

خارجی مسائل میں دوسری اہم چیز جو ہمارے لئے اور ساری دنیا

کے لئے جاذب توجہ بنی ہوئی ہے وہ اینگلو امریکن بلاک اور کمیونسٹ بلاک کی وہ عالمگیر کشمکش ہے جس نے دنیا بھر کو پھر ایک جنگِ عظیم کے خطرے میں مبتلا کر دیا ہے۔ میں بغیر کسی لاگ لپیٹ کے یہ کہہ دینا چاہتا ہوں کہ ہم اس کشمکش کے دونوں فریقوں میں سے کسی کو بھی حق بجانب نہیں سمجھتے۔ ہمارے نزدیک دونوں یکساں فاسد و مفسد ہیں۔ ہماری ہمدردی ان میں سے کسی کے ساتھ بھی نہیں ہے، اور ہم چاہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہمیں اتنی طاقت عطا فرمائے کہ ہم ان دونوں بلاؤں سے بچ کر رہ سکیں۔ ہمیں اِن میں سے کسی کے اندر بھی حق اور انصاف اور راستی کا شائبہ تک نظر نہیں آتا کہ اس پر ہم فریفتہ ہوں۔ ہمارے نزدیک حق کا تقاضا بھی یہی ہے اور ملک کی سلامتی بھی اسی میں ہے کہ ان کی کشمکش میں ہم غیر جانبدار، بلکہ اس سے بالکل بے تعلق رہیں تاہم اگر خدانخواستہ کبھی ایسے حالات پیدا ہو گئے کہ ہمیں ان میں سے کسی ایک کو ترجیح دینی پڑی تو اُس وقت شریعت کے قاعدے کے مطابق، اُس وقت کے حالات کو دیکھتے ہوئے ہم یہ رائے قائم کریں گے کہ اِن دونوں بلاؤں میں سے کم تر درجہ کی بلا کونسی ہے۔ اس طرح کی ناگزیر صورت ابھی پیدا نہیں ہوئی ہے۔ اس لئے قبل از وقت اس بارے میں کسی اظہارِ رائے کی ضرورت نہیں۔

مسئلہ کشمیر

اس کے بعد میں ایک ایسے مسئلہ پر اظہارِ رائے کروں گا جو ہمارے لئے بیک وقت داخلی بھی ہے اور خارجی بھی، اور پھر ہماری قومی زندگی کے لئے غیر معمولی اہمیت بھی رکھتا ہے۔ یہ ہے کشمیر کا معاملہ

اس معاملہ میں ہمارا نقطۂ نظر نہ وطن پرستانہ ہے نہ قوم پرستانہ۔ ہم سارے معاملات کو سراسر حق پرستی کی نظر سے دیکھتے ہیں، اور یہی ہمارا نقطۂ نظر کشمیر کے معاملہ میں بھی ہے۔ ہماری یہ قطعی رائے ہے کہ کشمیر پر قبضہ کرنے میں ہندوستان نے سراسر زیادتی کی ہے اور اُس کے مقابلے

میں پاکستان کا دعویٰ بالکل حق بجانب ہے۔ سیدھی اور صاف بات یہ ہے کہ ہندوستان نے کشمیر پر قبضہ اس وجہ سے نہیں کیا کہ وہ اس کا حق تھا بلکہ صرف اس وجہ سے کیا کہ تقسیم کے وقت پاکستان کمزور تھا اور ہندوستان اتنی طاقت رکھتا تھا کہ اپنے حق سے زائد ایک چیز حاصل کر لے ــــ میں اس وقت اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتا کہ ہماری کمزوریوں کے ساتھ ہماری کوتاہیاں کیا تھیں۔ بہر حال یہ واقعہ اپنی جگہ بالکل عیاں ہے کہ اگر پاکستان نے اُس وقت کشمیر پر قبضہ کر لیا ہوتا تو کوئی معقول آدمی یہ تصور نہیں کر سکتا کہ ہندوستان بھی اُسی طرح کشمیر کا دعویٰ لے کر اٹھتا جس طرح آج پاکستان اٹھا ہے اور وہ بھی پاکستان کی طرح یہ چیلنج کرتا کہ آؤ، کشمیر میں استصواب رائے عام کرا کے دیکھ لو۔ وہ خود جانتا ہے کہ ہندوستان و پاکستان کی تقسیم محض مذہب کی بنیاد پر ہوئی تھی۔ وہ خود جانتا ہے کہ وہی علاقے پاکستان بنائے گئے جہاں مسلمان اکثریت میں تھے اور وہی علاقے ہندوستان میں شامل کیے گئے جن میں ہندوؤں کی اکثریت تھی۔ وہ خود جانتا ہے کہ تقسیم سے پہلے اور تقسیم کے دوران میں جو کشت وخون ہوا، جو قتل عام ہوا، جو لوٹ مار ہوئی، وہ سراسر اس بنیاد پر ہوئی کہ ہندوؤں اور سکھوں کے نزدیک ہر مسلمان کشتنی تھا اور مسلمانوں کے نزدیک ہر ہندو اور سکھ گردن زدنی تھا۔ ان ساری باتوں کو جانتے ہوئے کون یہ مان سکتا ہے کہ کشمیر جیسے مسلم اکثریت کے علاقے کو ہندوستان واقعی ایمانداری کے ساتھ اپنا حق سمجھتا تھا، اور اگر پاکستان اُس پر قابض ہو گیا ہوتا تو وہ بھی یہ دعویٰ کرنے کی جرأت کر سکتا تھا کہ استصواب رائے کرا کر دیکھ لیا جائے، کشمیر کے باشندے ہندوستان سے الحاق کے حق میں رائے دیں گے۔ پس یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے جسے ایک ہٹ دھرم آدمی کے سوا کوئی جھٹلا نہیں سکتا کہ کشمیر پر ہندوستان کا قبضہ حق کی بنیاد پر نہیں ہوا بلکہ سراسر طاقت کی دھاندلی سے ہوا ہے۔ اور اس معاملہ کا سب سے زیادہ افسوسناک پہلو یہ ہے کہ ہندوستان نے یہ صریح بے شرمانہ دھاندلی اُس زمانہ میں کی جبکہ گاندھی جیسا اخلاق کا علمبردار وہاں موجود تھا، اور اُس شخص کے ہاتھوں کی جو انگریزوں کی غلامی کے دور میں سیاست کو طاقت کے بجائے

اخلاق پر قائم کرنے کا سب سے زیادہ بلند بانگ مدعی بنا ہوا تھا، یعنی پنڈت جواہر لال نہرو۔
کشمیر اور جوناگڑھ کے معاملہ میں ہندوستان نے بیک وقت جو دو مختلف پالیسیاں اختیار کی ہیں، پنڈت نہرو کے سوا اور کون آدمی ایسا ہوگا جو عقل رکھتے ہوئے ان دونوں پالیسیوں کو متضاد ماننے سے انکار کرسکے؟ ایک جگہ آپ اس بنیاد پر قبضہ کرتے ہیں کہ وہاں کا حکمران چاہے مسلمان ہو مگر آبادی کی اکثریت ہندو ہے۔ دوسری جگہ آپ اس بنیاد پر قبضہ کر لیتے ہیں کہ وہاں کی آبادی کی اکثریت چاہے مسلمان ہو مگر حکمران ہندو ہے۔ ایک جگہ کا حکمراں پاکستان سے الحاق کا اعلان کرتا ہے تو آپ اسے اس لیے ماننے سے انکار کرتے ہیں کہ حکمراں نے الحاق کا فیصلہ باشندوں کی رضامندی حاصل کیے بغیر کر دیا ہے۔ دوسری جگہ کا حکمراں ٹھیک اسی طرح باشندوں کی رضامندی حاصل کیے بغیر ہندوستان سے الحاق کا اعلان کرتا ہے تو آپ اسے فوراً قبول کر لیتے ہیں اور اس الحاق کی دستاویز کو ایک برابر آئینی دستاویز سمجھ کر دانتوں سے پکڑ لیتے ہیں۔ ایک جگہ آپ کے نزدیک اپنے علاقے کی قسمت کا فیصلہ کرنا باشندوں کا کام ہے اور حکمراں کا فیصلہ بالکل بے معنی ہے، کیونکہ وہاں کے باشندوں کی اکثریت ہندو اور حکمراں مسلمان ہے۔ دوسری جگہ اس کے بالکل برعکس حکمراں کا فیصلہ آپ کے نزدیک بالکل بامعنی اور سو فی صدی قانونی ہے اور اس کو تسلیم کرنے کے لیے باشندوں کی مرضی معلوم کرنے کی کوئی ضرورت نہیں، کیونکہ وہاں حکمراں ہندو ہے اور باشندوں کی اکثریت مسلمان۔ کیا یہ کھلا ہوا تضاد نہیں ہے؟ یہ حرکتیں ایک ایسے سیاسی لیڈر کے سوا اور کون کر سکتا ہے جو حق اور انصاف اور راستی کے بجائے قوت اور زور کی بنا پر اپنی پالیسی بناتا ہو اور بالکل ایک ابن الوقت (Opportunist) کی طرح ہر موقع کے لیے ایک نیا اصول گھڑ لیتا ہو؟ واقعہ یہ ہے کہ پنڈت نہرو نے اپنے اس طرزِ عمل سے اپنی اُس ساری عزت و وقعت کو خاک میں ملا دیا ہے جو انہوں نے عمر بھر سیاست میں اخلاق کی علمبرداری کر کے حاصل کی تھی۔
اس موقع پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ میں یہ بھی ظاہر کر دوں کہ ہماری نگاہ میں کشمیر

کے معاملہ کی اصل اہمیت اور غیر معمولی اہمیت کس وجہ سے ہے۔ اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ ہم اپنے ملک کے لیے ایک وسیع علاقہ حاصل کرنا چاہتے ہیں، یا اپنے ملک کی معیشت کے لیے کشمیر کو ناگزیر پاتے ہیں۔ یہ ایک قوم پرست اور وطن پرست کا نقطۂ نظر تو ہو سکتا ہے، مگر ایک حق پرست کا نقطۂ نظر نہیں ہو سکتا۔ ہمارے لیے اس معاملہ کی ساری اہمیت صرف اس وجہ سے ہے کہ کشمیر کے ۳۰-۳۵ لاکھ مسلمانوں کا مستقبل ہم کو خطرے میں نظر آرہا ہے۔ کون نہیں جانتا کہ جموں کے علاقے سے بکثرت مسلمان نکالے جا چکے ہیں، کس کو معلوم نہیں ہے کہ پٹھانکوٹ سے دلی تک کا علاقہ مسلمانوں سے خالی ہو چکا ہے، کس سے یہ بات چھپی ہوئی ہے کہ ہندوستان نے قصداً ایک سوچی سمجھی اسکیم کے تحت اپنے اُن تمام علاقوں کو مسلمانوں سے خالی کرایا ہے جو مغربی پاکستان کی سرحد سے متصل واقع ہیں اور اب اسی پالیسی پر مشرقی پاکستان کی طرف بھی عمل ہو رہا ہے؟ اس کو دیکھتے ہوئے کبھی یہ توقع ہی نہیں کی جا سکتی کہ اگر کشمیر کی قسمت کا آخری فیصلہ ہندوستان کے حق میں ہو گیا تو وہ زیادہ مدت تک اپنے انتہائی شمالی سرے پر ایک مسلم اکثریت کے علاقے کو برداشت کرتا رہے گا۔ کبھی نہ کبھی وہ وقت ضرور آئیگا جب کشمیر کی ساری مسلمان آبادی، مشرقی پنجاب کے مسلمانوں کی طرح گھروں سے نکالی جائیگی اور مار مار کر اس کو بیک بینی و دوگوش پاکستان کی طرف دھکیل دیا جائیگا۔ آج کشمیریوں کی جو مدارات ہندوستان میں ہو رہی ہے یہ ہمیشہ رہنے والی چیز نہیں ہے۔ یہ سب کچھ تو بس اسی وقت تک ہے جب تک کشمیر کا قضیہ معلق ہے۔ اس کے یکسو ہو جانے کے بعد یہ ہرگز امید نہیں کی جا سکتی کہ ہندوستان اس مسلم اکثریت کو پاکستان کے قریب یوں اطمینان سے بیٹھا رہنے دیگا۔ اس لیے اُن لاکھوں انسانوں کی خاطر جو کشمیر میں بستے ہیں، ان کی جان اور مال اور آبرو کی خاطر، اور ان کے پیدائشی انسانی حقوق کی خاطر ہم یہ ضروری سمجھتے ہیں کہ انہیں ہندوستان کے چنگل سے نکالا جائے، اور ہم صاف کہتے ہیں کہ اس مقصد کے لیے ہم آخری حدود تک جانے کو تیار ہیں۔

داخلی مسائل

دینی حالت خارجی مسائل کے بعد اب میں ملک کے داخلی حالات پر ایک مختصر تبصرہ کرونگا۔ دوسرے تمام معاملات سے بڑھ کر جو چیز ہمارے لیے اہمیت رکھتی ہے وہ ہماری قوم کی دینی حالت ہے۔ اس حالت کا جب ہم جائزہ لیکر دیکھتے ہیں تو ہمیں نظر آتا ہے کہ دینی حیثیت سے ہم مسلسل انحطاط کی طرف جا رہے ہیں اور پاکستان بننے کے بعد یہ رفتارِ انحطاط کم ہونے کے بجائے کچھ اور زیادہ تیز ہو گئی ہے۔ یہ ہمارے نزدیک خطرہ نمبر ۱ ہے۔

ہم دیکھ رہے ہیں کہ ہماری آبادی کا بڑا حصہ ––– بہت بڑا حصہ ––– احکام الٰہی سے بُعد رکھتا ہے۔ ہم دیکھ رہے ہیں کہ ہمارے ملک میں علانیہ خدا کے احکام کی خلاف ورزی ہو رہی ہے اور ایسے نازک وقت میں بھی لوگ اُس سے باز نہیں آتے جبکہ ہم اپنے آپ کو چاروں طرف سے خطرات میں گھرا ہوا پاتے ہیں اور خدا سے نصرت مانگ رہے ہوتے ہیں۔ ہم دیکھ رہے ہیں کہ ہمارے ملک میں فرنگیت اور فسق و فجور کی رَو بڑھتی چلی جا رہی ہے اور آج وہ کچھ ہو رہا ہے جو انگریز کے زمانے میں بھی نہ ہوتا تھا۔ ہم دیکھ رہے ہیں کہ اسلام آج بھی اسی طرح بے بس ہے جس طرح انگریز کے زمانہ میں تھا۔ بلکہ اس کے اصول اور قوانین اور احکام اُس وقت سے کچھ زیادہ پامال کیے جا رہے ہیں، جرأت اور جسارت کے ساتھ کیے جا رہے ہیں، کھلم کھلا کیے جا رہے ہیں، بڑے پیمانے پر کیے جا رہے ہیں، ان کے خلاف چلنے کی علانیہ تبلیغ ہو رہی ہے، اور عوام الناس کو ان کے خلاف چلانے کی منظم کوششیں کی جا رہی ہیں۔

اِس کے سب سے زیادہ افسوسناک پہلو دو ہیں۔ ایک یہ کہ سرکاری ملازمتوں سے، فوج اور سِول دونوں قسم کی ملازمتوں سے، اُن لوگوں کو چُن چُن کر نکالا جا رہا ہے جن کے اندر ایمان اور دینداری کی کچھ بھی رمق پائی جاتی ہے۔ اس طرح حکومت کی مشینری روز بروز اسلامی

رجحانات رکھنے والے عناصر سے خالی ہوتی جارہی ہے اور اُس پر کمیونسٹ اور دوسرے مخالف دین عناصر قابض ہوتے چلے جارہے ہیں۔ دوسرا پہلو یہ ہے کہ فرنگیت کی اِس تبلیغ اور اس کو رواج دینے کی اِس منظم کوشش کا نشانہ خاص طور پر ہماری عورتیں بنائی جارہی ہیں۔ زور لگایا جارہا ہے کہ اسلامی تہذیب و اخلاق کے اُس آخری حصار کو بھی توڑ دیا جائے جہاں ہر طرف سے پسپا ہو کر اُس نے پناہ لی تھی۔ طرح طرح سے تدبیریں کی جارہی ہیں کہ اُس گہوارے کو بھی گندہ کر کے رکھ دیا جائے جہاں ایک مسلمان بچہ سب سے پہلے آنکھ کھولتا ہے اور جہاں اسے مذہب، اخلاق، آدمیت، اور اجتماعی برتاؤ کا پہلا سبق ملتا ہے۔

یہ سب کچھ اُن مقاصد کے بالکل خلاف ہے جن کا نام لیکر پاکستان مانگا گیا تھا اور جن کے اظہار و اعلان ہی کے طفیل اللہ تعالیٰ نے یہ ملک ہمیں بخشا تھا۔ کہا یہ گیا تھا کہ ہمیں ایک خطۂ زمین اس لیے درکار ہے کہ اس میں ہم مسلمان کی سی زندگی بسر کرسکیں، اسلام کو پھر سے زندہ اور تازہ کرسکیں، اور اسلام کی بنیادوں پر خود اپنے ایک تمدن اور اپنی ایک تہذیب کی عمارت اٹھاسکیں۔ مگر جب خدا نے وہ خطہ دے دیا تو اب کیا یہ جارہا ہے کہ اسلام کے رہے سہے آثار بھی مٹائے جارہے ہیں اور اُس تہذیب و اخلاق و تمدن کی عمارت مکمل کی جارہی ہے جس کی نیو یہاں انگریز رکھ گیا تھا۔

اس صورتِ حال کو ہم جس وجہ سے خطرہ نمبر ۱ سمجھتے ہیں وہ یہ ہے کہ یہ صریح طور پر خدا کے غضب کو دعوت دینے کی ہم معنی ہے۔ ہم ہرگز یہ توقع نہیں کرسکتے کہ اپنے رب کی کھلی کھلی نافرمانیاں کر کے ہم اُس کی رحمت اور نصرت کے مستحق بن سکیں گے۔

اس میں خطرے کا یہ پہلو بھی ہے کہ پاکستان کے عناصر ترکیبی میں نسل، زبان، جغرافیہ کوئی چیز بھی مشترک نہیں ہے۔ صرف ایک دین ہے جس نے اِن عناصر کو جوڑ کر ایک ملت بنایا ہے۔ دین کی جڑیں یہاں جتنی مضبوط ہونگی اتنا ہی پاکستان مضبوط ہوگا۔ اور وہ جتنی کمزور ہونگی اتنا ہی پاکستان کمزور ہوگا۔

اس میں خطرے کا پہلو یہ بھی ہے کہ یہ کیفیت ہمارے ہاں جتنی زیادہ بڑھے گی، ہماری قوم میں منافقت اور عقیدہ وعمل کے تضاد کی بیماری بڑھتی چلی جائیگی۔ یہ ظاہر ہے کہ مسلمانوں کے اندر اسلامی احکام کی خلاف ورزی پھیلا دینا جس قدر آسان ہے، اُن کے دلوں سے اسلامی عقائد کو نکال پھینکنا اتنا آسان نہیں ہے۔ اب اگر صورت حال یہ ہو کہ مسلمان عقیدۃً فرض کو فرض، حلال کو حلال اور حرام کو حرام ہی سمجھتے رہیں مگر ان میں روز بروز ایسے افراد کی تعداد بڑھتی چلی جائے جو فرض کو فرض جانتے ہوئے ادا نہ کریں، حکم کو حکم مانتے ہوئے اس کی تعمیل نہ کریں، اور حرام کو حرام سمجھتے ہوئے اس میں خفیہ اور علانیہ مبتلا ہوں، تو اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ ہم اپنی آبادی کو روز بروز زیادہ منافق بنا رہے ہیں، اس کے کیرکٹر کی بنیادیں ڈھیلی کر رہے ہیں، اس کے اندر سے فرض شناسی اور پابندی قانون کی جڑیں کاٹ رہے ہیں، اور اس کو یہ تربیت دے رہے ہیں کہ وہ اپنے اعتقاد کے خلاف عمل کرنے کی خوگر ہو جائے۔ کیا کوئی شخص یہ سمجھتا ہے کہ یہ تپ دق کی بیماری جو ہماری مذہبی زندگی میں پھیلائی جا رہی ہے، صرف مذہب کے دائرے تک ہی محدود رہ جائے گی؟ ہماری پوری قومی عمارت کو کھوکھلا کر کے نہ رکھ دیگی؟ جو مسلمان خدا اور رسول کے ساتھ مخلص نہ رہے اُس سے آپ کیا توقع رکھتے ہیں کہ وہ قوم، وطن، ریاست اور کسی دوسری چیز کے لیے مخلص ثابت ہوسکے گا؟

اس میں خطرے کا یہ پہلو بھی ہے کہ غیر اسلامی اخلاق و اطوار کو رواج دینے کی کوششیں جتنی زیادہ بڑھ رہی ہیں، ملک کے دین پسند عناصر میں اُن کے مقابلے اور مزاحمت کا جذبہ بھی اتنا ہی زیادہ بڑھتا جا رہا ہے اور اس چیز نے ملک کو صریح طور پر دو کیمپوں میں بانٹ دیا ہے۔ ایک اسلامی کیمپ اور دوسرا غیر اسلامی کیمپ۔ غور کرنے کی بات ہے کہ یہ وقت جبکہ ہماری نئی مملکت ابھی ابھی قائم ہوئی ہے آیا اس بات کا متقاضی تھا کہ ہم اس کی تعمیر و ترقی میں مل جل کر اپنی ساری قومی طاقت صرف کر دیتے، یا اس بات کا کہ ہم دو کیمپوں میں بٹ کر اپنی طاقتیں آپس کی کشمکش میں صرف کرتے؟ کچھ سوچیے کہ یہ کشمکش ہمیں

کدھر لے جا رہی ہے اور آخر کہاں پہنچا کر چھوڑے گی ؟

اخلاقی حالت دین کے بعد ہماری نگاہ میں دوسری چیز جو سب سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے، اخلاق ہے۔ اس حیثیت سے جب ہم ملک کی حالت کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ ہمارا عام اخلاقی انحطاط حقیقت میں ہمارے اس ملک کے لیے خطرہ نمبر ۲ ہے۔

ملک کے تمام طبقے کیرکٹر کے بودے پن اور بے ضمیری میں مبتلا ہیں۔ اخلاقی خرابیاں ایک وبا کی طرح پھیل رہی ہیں۔ تمام اخلاقی حدود توڑ کر رکھ دیئے گئے ہیں اور عام طور پر لوگوں کے دلوں سے یہ احساس مٹتا جا رہا ہے کہ اخلاق بھی کوئی چیز ہے جس کے تقاضوں کا کچھ لحاظ آدمی کو کرنا چاہیے۔ عوام ہوں یا تعلیم یافتہ حضرات، سرکاری افسر اور اہلکار ہوں یا سیاسی لیڈر اور پارٹیوں کے کارکن، اخبار نویس ہوں یا اہل قلم، تاجر ہوں یا اہل حرفہ، زمیندار ہوں یا کسان، جس طبقے کو دیکھیے، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ اخلاقی ذمہ داریوں کو بھول چکا ہے اور کسی ایسی حد سے واقف نہیں رہا ہے جس پر وہ اپنی اغراض و خواہشات کے پیچھے دوڑتے ہوئے رک جائے۔ ہر شخص اپنا مطلب حاصل کرنے کے لئے ہر بدتر سے بدتر ذریعہ اختیار کرنے پر تُلا ہوا ہے۔ حرام اور حلال کی تمیز اُٹھ چکی ہے۔ گناہ اور صواب کا احساس مٹ گیا ہے۔ برائی اور بھلائی کے فرق سے نگاہیں بند کر لی گئی ہیں۔ لوگوں کے ضمیر نے ان کے ذاتی مفاد کے آگے سپر ڈال دی ہے۔ فرائض کو لوگ بھول چکے ہیں اور حقوق سب کو یاد ہیں۔ جھوٹ اور فریب اور چالبازی کام نکالنے کے مقبول ترین ہتھیار بن گئے ہیں۔ رشوت اور خیانت اور حرام خوری کے دوسرے ذرائع شیرِ مادر کی طرح حلال ہو گئے ہیں۔ مال والوں کے مال ضمیروں اور عصمتوں اور شرافتوں کو خریدنے میں صرف ہو رہے ہیں اور بیچنے والے دھڑتے سے اخلاق کے وہ سارے جوہر بیچ رہے ہیں جو ان کی نگاہ میں روپے سے کم قیمت رکھتے ہیں۔

میں اس کو اس ملک کے لیے خطرۂ عظیم سمجھتا ہوں۔ کیرکٹر ہی وہ اصل طاقت ہے جس کے بل پر کوئی قوم زندہ رہ سکتی ہے اور ترقی کر سکتی ہے۔ اگر اس طاقت سے ہم محروم ہو جائیں، اگر ہمارے اخلاق کی جان نکل جائے اور ہم بالکل حدود سے ناآشنا ہو کر رہ جائیں تو ترقی کرنا تو

درکنار ہم ایک آزاد قوم کی حیثیت سے زندہ بھی نہیں رہ سکتے

تعلیمی حالت اب ذرا تعلیمی حالت کو دیکھیے۔ دین اور اخلاق کے بعد میرے نزدیک تعلیم کی اہمیت دوسری سب چیزوں سے زیادہ ہے، کیونکہ یہی وہ چیز ہے جو نئی نسلوں کو بناتی ہے اور اسی پر ایک قوم کے مستقبل کا انحصار ہوتا ہے۔ اگر موجودہ نسل بہتر سے بہتر بھی ہو، زیادہ سے زیادہ قابلیتوں کی مالک بھی ہو تو اس کی خوبیاں بس اپنے ہی دور کی خدمت کر سکیں گی۔ قوم کا مستقبل بہر حال آنے والی نسلوں ہی کے ہاتھ میں رہیگا۔ اور وہ ان نسلوں کو اچھی تعلیم ملنے سے روشن، اور بُری تعلیم ملنے سے تاریک ہوگا۔

تعلیم کی اس اہمیت کو نگاہ میں رکھ کر جب ہم حالات کا جائزہ لیتے ہیں تو یہ دیکھ کر ہمارا دل بیٹھ جاتا ہے کہ ہمارے ملک میں تعلیم کا معیار روز بروز پست ہوتا جا رہا ہے جیسی کچھ بری بھلی تعلیم انگریز کے زمانے میں تھی آج وُہ اس معیار پر بھی برقرار نہیں رہی۔ جو لوگ مدارس میں بچوں کو بھیجتے ہیں اور جو لوگ خود تعلیم گاہوں میں کام کر رہے ہیں، دونوں سے پوچھ کر دیکھ لیجیے، کوئی بھی موجودہ تعلیمی حالت سے مطمئن نہیں ہے۔ شاید ہی کوئی شخص ہمارے درمیان ایسا پایا جاتا ہو جو اس صورت حال کو خطرے اور تشویش کی نگاہ سے نہ دیکھ رہا ہو۔

پھر اسلامی نقطۂ نظر سے تعلیم کے معاملہ میں انگریز کے زمانے کی بہ نسبت آج کوئی قابل لحاظ تغیر واقع نہیں ہُوا ہے۔ جو کچھ ہماری نئی نسلوں کو انگریز بنا رہا تھا وہی کچھ آج ہم خود بنا رہے ہیں۔ وہی فلسفۂ زندگی، وہی فکر و نظر، وہی خیالات، وہی ذہنیتیں، وہی قدریں، اور وہی علم و عقل کے سانچے۔ کوئی چیز بھی اُس وقت سے آج تک نہیں بدلی ہے۔ حالانکہ پہلے اس بات کا فیصلہ کہ ہماری آئندہ نسلوں کو کیا بننا چاہیے، غیروں کے ہاتھ میں تھا، اور آج خود ہمارے ہاتھ میں ہے۔ اس سے بڑھ کر ہماری بدقسمتی اور نادانی اور کیا ہو سکتی ہے کہ جو تعلیمی اسکیم ہمارے اخلاق و تمدن اور ہماری تہذیب کی جڑیں کاٹنے کے لیے غیروں نے بنائی تھی وہ اب خود ہمارے اپنے ہاتھوں عمل میں آ رہی ہے۔

پھر ہم دیکھ رہے ہیں کہ اخلاقی تربیت سے ہمارا نظام تعلیم بالکل خالی ہے ہم کتابیں تو پڑھا

رہے ہیں مگر انسان نہیں بنا رہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ اگر کسی کو انسان نہ بنایا جائے، اخلاق کی تربیت دے کر اس کے اندر پاکیزہ جذبات، شریفانہ تخیلات، اور عمدہ خصائل نہ پیدا کئے جائیں۔ اس کو اصول کی پابندی اور اخلاقی حدود کی نگہداشت نہ سکھائی جائے، تو تعلیم پاکر وہ سوسائٹی کے لیے ایک مفید رکن بننے کے بجائے الٹا ایک خطرناک عنصر بن جائے گا۔ مثلاً آپ ایک شخص کو ڈاکٹر بناتے ہیں مگر اسے انسان نہیں بناتے۔ اس کا نتیجہ اس کے سوا اور کیا ہوسکتا ہے کہ وہ ہزاریں بندگانِ خدا کی جانوں سے کھیلے اور لوگوں کی صحتیں اور ان کی زندگیاں اس شخص کے لیے محض روپیہ بنانے کے وسائل بن کر رہ جائیں۔ یا مثلاً ایک شخص قانون پڑھ کر آپ کی درس گاہوں سے نکلتا ہے مگر انسانیت کا سبق سیکھ کر نہیں آتا۔ ظاہر ہے کہ ایسا قانون داں اگر وکیل بنے گا تو قانون کو جرائم پیشہ لوگوں کا کھلونا بنائے گا اور جج بنے گا تو عدل کے بجائے ظلم کریگا۔ یہ آخر انسانیت کے بغیر صرف کتابی تعلیم پائے ہوئے لوگ ہی تو ہیں جو آج سرکاری محکموں میں بیٹھے رشوت کھا رہے، حق تلفیاں اور ہر طرح کی بے ایمانیاں کر رہے ہیں، جو تجارت میں بلیک مارکٹنگ اور دوسری بددیانتیوں کے مرتکب ہو رہے ہیں، جو صحافت میں ضمیر فروشی کی بدترین مثالیں پیش کر رہے ہیں، اور جن کی اخلاقی خرابیوں سے آج ہماری اجتماعی زندگی کا ہر شعبہ گندگیوں سے آلودہ ہو رہا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جو تعلیم اخلاقی تربیت سے خالی ہو وہ ایک قوم کے لیے نفع سے بڑھ کر مضرت کے پہلو رکھتی ہے۔

یہ تعلیمی حالت ہمارے لیے خطرہ ۳ ہے۔

انتظامی حالت اس کے بعد جب ہم ملک کے انتظام پر نگاہ ڈالتے ہیں تو صاف نظر آتا ہے کہ وہ ہر پہلو میں انگریزی دور کے معیار سے گر گیا ہے اور اس تیزی سے گرتا جا رہا ہے کہ وہ خطرے کی حد قریب آ لگی ہے جہاں پہنچ کر ایک ملک کا نظم و نسق تاشے کی طرح بیٹھ جاتا ہے۔ انگریزی کے زمانے میں سرکاری محکموں کے ڈسپلن، کارکردگی، اور سرکاری ملازمین کی فرض شناسی کا جو حال تھا، آج اس کا ۲۵ فی صدی بھی نہیں ہے۔ البتہ رشوت، دوست نوازی، اقربا پروری،

خیانت، غبن اور سعی و سفارش کی کارفرمائی میں سو فی صدی اضافہ ہوگیا ہے۔ انصاف کا حال یہ ہے کہ عوام الناس نہ تو عدالتوں سے اس کی امید رکھتے ہیں اور نہ انتظامی عہدہ داروں سے۔ عام احساس یہ ہے کہ آدمی کو جو کچھ مل سکتا ہے یا روپے سے مل سکتا ہے یا کسی بااثر آدمی کی قرابتداری یا سفارش سے۔ یہ دونوں چیزیں ہوں تو آدمی اپنی ناجائز اغراض بھی حاصل کر سکتا ہے، اور یہ نہ ہوں تو اس کے جائز حقوق بھی ملنے مشکل ہیں۔ بڑے افسروں سے لے کر چھوٹے کارکن تک بالعموم اس قدر خود غرض، نافرض شناس، اور بیباک ہو چکے ہیں کہ اپنے ذرا سے فائدے کے لیے قوم اور ریاست کا بڑے سے بڑا نقصان کر دینے میں بھی دریغ نہیں کرتے۔ حق اور انصاف اُن کے لیے بے معنی الفاظ بن گئے ہیں۔ ڈیوٹی کی انہیں کوئی پروا نہیں رہی ہے۔

اس سلسلے میں اپنی طرف سے کچھ کہنے کے بجائے میں آپ کو اُس رپورٹ کی طرف توجہ دلاؤں گا جس کے اقتباسات ابھی ابھی ۴ نومبر کے "ڈان" میں شائع ہوئے ہیں۔ یہ رپورٹ پنجاب کے نظم و نسق سے متعلق ہے اور وزیر اعظم پنجاب کے پارلیمنٹری سکرٹری، ملک قادر بخش صاحب نے اسے مرتب کیا ہے۔ اس کے چند فقرے یہ ہیں:-

"متعدد اضلاع میں انتظامی حالت بالکل ناگفتہ بہ ہے۔ معاملات میں بروقت کارروائی ہونے زمانے کی ایک داستان بن گئی ہے جس سے آج کے سرکاری ملازمین نا آشنا ہیں۔ ہر محکمے میں رشوت کا بازار گرم ہے۔ اقربا نوازی، دوست پروری، بے پروائی اور نکما پن ایسے عیوب ہیں جن کا آئے دن مشاہدہ ہوتا رہتا ہے۔"

"درخواست گذاروں کو کسی سرکاری محکمے میں درخواست دینے کے بعد کچھ پتہ نہیں چلتا کہ ان کی درخواست کہاں ہے اور اس کا کیا بنا۔ انکی درخواستوں کا کوئی نتیجہ برآمد ہونے کی بس ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ ہے کہ برابر اہل کاروں کی مٹھی گرم کرتے رہیں۔"

"میں نے سرگودھا اور منٹگمری کے دفتر آبادکاری کا معائنہ کیا۔ ان کی بے ترتیبی

کا یہ حال تھا کہ وہ دفتر کے بجائے کباڑیے کی دوکان معلوم ہوتے تھے "
"ایک بڑا قیمتی خزانہ جو سابق غیر ملکی حکمراں ہمارے لیے چھوڑ گئے ہیں وہ مالگزاری اور دوسرے محکموں کے سرکاری ریکارڈ ہیں جن کے بغیر کوئی نظم حکومت باقاعدگی کے ساتھ نہیں چلایا جاسکتا۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ تین چار سال کی مختصر مدت ہی میں ان کا حال نہایت ابتر ہو چکا ہے۔ (اس سلسلہ میں ملک صاحب نے متعدد مثالیں ایسی دی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ کاغذاتِ مال میں جھوٹے اندراجات کرنے اور جعلی دستاویزیں شامل کر دینے کا بھی طریقہ چل پڑا ہے)۔"
"اضلاع میں مجھے یہ دیکھ کر سخت صدمہ ہوا کہ مجسٹریٹ احساس کہتری میں مبتلا ہیں ۔۔۔ بدقسمتی سے نوبت یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ مجسٹریٹ یہ سمجھنے لگے ہیں کہ وہ اپنے علاقہ کی پولیس پر کوئی قابو نہیں رکھتے ۔ایک زمانہ تھا جبکہ ضلع کے پولیس افسر اپنے آپ کو علاقہ مجسٹریٹ کے ماتحت امن وامان کے قیام کا ایک ذریعہ سمجھتے تھے۔ مگر اب مجسٹریٹوں کے اندر یہ احساس عام ہے کہ آج پولیس ہر وقت خود ان کو نقصان پہنچا سکتی ہے"
"مجھے یہ کہنا چاہیے کہ آدمی کے لیے ایک جنگل میں زندگی گزارنا اس سے بہتر ہے کہ وہ ایک ایسی متمدن سوسائٹی میں زندگی بسر کرے جہاں وہ بے لاگ انصاف کی نہ عدالتوں سے توقع رکھتا ہو اور نہ انتظامی حکام سے ۔ لوگوں کے دلوں میں سو فی صدی یہ خیال بیٹھ گیا ہے کہ وہ کسی بااثر سفارش کے بغیر کہیں سے بھی انصاف نہیں پا سکتے"
یہ ہے پنجاب کی صورتِ حال جو ایک سرکاری رپورٹ میں تسلیم کی گئی ہے ۔ اور میں معتبر معلومات کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ مغربی پاکستان کے دوسرے صوبوں کا حال اس معاملہ میں پنجاب سے بدرجہا زیادہ بدتر ہے۔ مشرقی پاکستان کے متعلق میں کچھ نہیں کہہ سکتا، کیونکہ وہاں کے حالات کا براہِ راست مشاہدہ کرنے کا موقع مجھے ابھی تک نہیں ملا ہے۔

[اس موقع پر حاضرین میں سے ایک صاحب نے اعتراض کیا کہ آپ پنجاب کی جس رپورٹ کا حوالہ دے رہے ہیں اس کی سرکاری طور پر تردید ہو چکی ہے۔ اس کے جواب میں مقرر نے کہا:]

مجھے معلوم ہے کہ اس رپورٹ کی تردید میں حکومت پنجاب کی طرف سے ایک بیان شائع ہوا ہے میں نے اس بیان کو پڑھا ہے۔ اس میں تردید تو صرف ایک دو واقعات ہی کی گئی ہے۔ باقی سارا بیان جو کچھ ظاہر کرتا ہے وہ صرف یہ ہے کہ حکومت پنجاب اس رپورٹ کا راز فاش ہونے سے سخت پریشان ہوئی ہے اور بھونڈے طریقے سے کچھ لیپ پوت کرنا چاہتی ہے۔ یہ بھی ایک افسوسناک بات ہے کہ حقائق کو صاف صاف تسلیم کرنے اور ان کا علاج کرنے کے بجائے ان سے آنکھیں بند کر لینے کو ترجیح دی جاتی ہے۔ جو بیماری فی الواقع ہمارے جسم میں موجود ہے اور ہمیں اندر ہی اندر کھائے جا رہی ہے، کیا محض اتنی بات سے دُور ہو جائے گی کہ آپ نے اس کی موجودگی کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا؟

میں نے ملک قادر بخش صاحب کی رپورٹ کا جو حوالہ دیا ہے اس سے شاید معترض کو یہ غلط فہمی ہوئی ہے کہ نظم و نسق کی خرابیوں کے متعلق میرا ذریعۂ معلومات صرف یہی ایک رپورٹ ہے اور شاید اسی رپورٹ کی بنیاد پر میں یہ کہہ رہا ہوں کہ ملک کا نظم و نسق بگڑ رہا ہے۔ حالانکہ میں نے اس رپورٹ کو یہاں اس حیثیت سے پیش نہیں کیا ہے کہ یہ ان حالات کی موجودگی کا ثبوت ہے بلکہ صرف اس حیثیت سے پیش کیا ہے کہ اب یہ واقعات عالمِ بالا میں بھی تسلیم کر لیے گئے ہیں۔ اگر بالفرض اس رپورٹ کی سرکاری طور پر تردید ہو گئی ہے تو اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ یہ واقعات حقیقت میں واقعات نہیں رہے، بلکہ اس کے معنی صرف یہ ہیں کہ بڑی سرکاروں کو اب تک ان کے موجود ہونے سے انکار ہے۔ رہے واقعات، تو وہ تو روزِ روشن میں موجود ہیں۔ ہر وقت، ہر جگہ، پبلک کے ہر آدمی کو ان سے سابقہ پیش آ رہا ہے۔ جب چاہیے، جس شہر، جس محلے، جس بستی، جس گاؤں میں چاہیے، عام آدمیوں کے درمیان چل پھر کر پوچھ لیجیے کہ عدالتوں اور سرکاری محکموں اور سرکاری افسروں سے جب کبھی انہیں معاملہ پڑتا ہے تو وہ کن حالات سے دوچار ہوتے ہیں۔ حکومت کے بڑے بڑے ذمہ دار عہدہ داروں سے پوچھ دیکھیے کہ وہ انگریزی دور کی بہ نسبت آج اپنے محکموں میں

ڈسپلن کا انکار کر دے گی کہ فرض شناسی اور دیانت کا کیا حال پاتے ہیں۔ اگر ان باتوں سے کسی کو انکار ہے تو میں چیلنج کرتا ہوں کہ نظم و نسق کی حالت کا جائزہ لینے کے لیے ایک کھلی پبلک تحقیقات کرالی جائے معلوم ہو جائیگا کہ حالات ملک خادم بخش کی رپورٹ سے بدتر ہیں یا بہتر؟

لیکن ہمارا فرض صرف اسی بات پر ختم نہیں ہو جاتا کہ ہم نظم و نسق کے بگڑنے اور خطرناک حد تک بگڑ جانے کی شکایت کریں۔ ہمیں اس سوال پر بھی غور کرنا چاہیے کہ چار سوا چار سال کے اندر حکومت کے انتظام میں اتنا بگاڑ آخر پیدا کیسے ہو گیا؟ کیا بات ہے کہ وہی ملازمین جو کل ایک غیر ملکی اقتدار کی بہت نسبتہً زیادہ محنت، زیادہ فرض شناسی اور زیادہ دیانت سے کر رہے تھے، آج وہ خود اپنی قومی حکومت کی خدمت کرنے میں اس سے آدھی قابلیت اور ایمانداری سے بھی کام نہیں لے رہے ہیں؟ کیا وجہ ہے کہ جو ملازمین ہندوؤں کے مقابلے میں پاکستان زندہ باد پکارتے تھے اور پاکستان کے عشق میں دیوانے ہو رہے تھے آج اسی محبوب و مطلوب پاکستان کو پالینے کے بعد وہ اس کی جڑیں کاٹنے لگے ہیں؟ ——

میں نے اس سوال پر مدتوں غور کیا ہے اور اس کو سمجھنے کے لیے حالات کی تحقیق کی ہے۔ میں صاف کہتا ہوں کہ سب سے بڑھ کر اس صورت حال کی ذمہ داری اُس پارٹی پر اور اُس کے لیڈروں اور کارپردازوں پر عائد ہوتی ہے جس کے ہاتھ میں قیام پاکستان کے بعد اقتدار کی باگ ڈور آئی۔ ان لوگوں نے یہ سمجھا کہ یہ پورا ملک ایک متروکہ جائداد ہے جو براہِ راست ان کو الاٹ ہوئی ہے۔ انہوں نے سرکاری ملازموں کو اپنا اور اپنے خاندانوں اور دوستوں کا ملازم اور اپنی پارٹی کا والنٹیر بنا لیا انہوں نے اپنی اغراض کے لیے ہر شعبۂ حکومت کے کارکنوں کو استعمال کرنا شروع کیا اور پھر انتخابات میں یہ خدمت بھی انہی کے سپرد کی کہ وہ ان کو اور انکی پارٹی والوں کو کامیاب کرانے کے لیے ہر طرح کی دھونس اور دھاندلی سے کام لیں۔ اس کے بعد آپ یہ کیسے امید کر سکتے ہیں کہ جو ارباب اقتدار خود سرکاری ملازمین سے غیر آئینی طریقے پر کام لیتے ہوں ان کے ماتحت ملازمین کسی ڈسپلن، کسی ضابطے اور کسی آئین عدل و دیانت کے پابند رہ سکیں گے؟ اس طرح کے ارباب اقتدار تو مجبور ہیں کہ اپنا کام لینے کے بعد اِن افسروں اور اہلکاروں کو رشوت، خیانت، ڈیوٹی سے گریز اور ضابطے کی خلاف ورزی

کے لیے پوری ڈھیل دے دیں۔ کیونکہ یہ ڈھیل دیے بغیر وہ اُن سے اپنی اغراض کی خدمت نہیں لے سکتے۔ نظم اور آئین کی پابندی ہوگی تو ہر معاملے میں ہوگی اور سب سے پہلے اُن لوگوں کو کرنی پڑے گی جن کے ہاتھ میں زمامِ کار ہو۔ ورنہ یہ ممکن نہیں ہے کہ وزیروں اور ان کی پارٹی کے ممبروں کے لیے تو آئین و ضابطہ رات دن توڑا جائے اور باقی سارے معاملات میں اس کی پوری پابندی ہوتی رہے۔

معاشی حالت | اب مَیں ملک کی معاشی حالت کا جائزہ لوں گا۔

واقعہ یہ ہے کہ اس وقت ہمارے ملک کا پورا معاشی نظام بے انصافی پر مبنی ہے۔ میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ بے انصافی اِس معاشی نظام کی بنیاد آج بنی ہے۔ نہیں، پہلے سے چلی آ رہی ہے لیکن قیامِ پاکستان کے بعد سے اب تک اِس میں کچھ اضافہ ہی ہوا ہے، کوئی کمی واقع نہیں ہوئی ہے۔ یہاں جو زور آور ہے، ذرائع اور وسائل رکھتا ہے، اُس کے لیے ترقی اور خوشحالی کی، بلکہ عیش و عشرت کی راہیں بھی کھلی ہوئی ہیں۔ مگر جو کمزور اور بے وسیلہ ہے اس کے لیے جینا تک مشکل ہے، عزت کے ساتھ جینا تو دُور کی چیز ہے۔

اس میں شک نہیں کہ ہمارے ملک کے با اثر اور با اختیار لوگ غریبوں سے ہمدردی کی باتیں بہت کرتے ہیں، مگر عمل کا جائزہ لینے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ غریبوں کے جذبات سے ناجائز فائدہ اٹھانے کے سوا اِن باتوں کا کوئی اور مقصد نہیں ہے۔ اس کی ایک نمایاں مثال وہ زرعی اصلاحات ہیں، جن کا ڈھول ایک مدت سے پیٹا جا رہا ہے۔ بظاہر ان کا مقصد یہ بتایا جاتا ہے کہ زمین کے معاملہ میں انصاف قائم کیا جائے۔ مگر ذرا گہری نظر سے جائزہ لیجیے تو صاف پتہ چل جاتا ہے کہ اس پوری اسکیم کی بنیاد "لڑاؤ اور حکومت کرو" کے اصول پر ہے۔ کوشش یہ کی جا رہی ہے کہ مالکانِ زمین اور کاشتکاروں کو ایک دوسرے کے خلاف لڑایا جائے اور ہر ایک کو دوسرے کے خلاف ہتھوڑا بنا کر دونوں کو مجبور کیا جائے کہ وہ برسرِ اقتدار گروہ کی شطرنج کے مہرے بن کر رہیں۔ اس طرح دیانتداری کے ساتھ حقیقی انصاف قائم کرنے کے بجائے ملک میں ایک خوفناک طبقاتی کشمکش کی آگ بھڑکائی جا رہی ہے جو بہت ممکن ہے کہ تھوڑی ہی مدت بعد خود ان کے قابو میں بھی نہ رہے اور ان کی اغراض

کے بجائے اشتراکیوں کی اغراض کے لیے مفید ثابت ہو۔

مالیات کے معاملہ میں جب ہم اپنی مملکت کی پالیسی پر نگاہ ڈالتے ہیں تو وہ ہر لحاظ سے غلط نظر آتی ہے ٹیکسوں کا جتنا بوجھ پبلک پر ڈالا گیا ہے اس میں انصاف ملحوظ نہیں رکھا گیا۔ غریب طبقوں پر ان کی طاقت سے زیادہ بار ڈالا گیا ہے اور امیر طبقوں پر ان کی طاقت سے کم، حالانکہ معاملہ اس کے برعکس ہونا چاہیے تھا۔ پھر ٹیکس لگانے اور وصول کرنے کے طریقوں میں کچھ ایسی خرابیاں پائی جاتی ہیں جو ملک کی رہی سہی اخلاقی حالت کو بھی برباد کر رہی ہیں۔ ان کی بدولت ہماری محصول گذار آبادی روز بروز زیادہ جھوٹی اور بد دیانت بنتی جا رہی ہے۔ جعلی رجسٹر رکھنا، جھوٹے حسابات پیش کرنا، جھوٹے حلفیہ بیانات دینا، اور رشوتیں دے دے کر اپنے اوپر سے ٹیکسوں کا بوجھ ہلکا کرنا، روزمرہ کا معمول بن گیا ہے اور حالات کچھ ایسے ہو چکے ہیں کہ ہماری سوسائٹی میں جو ایک ذرا سا عنصر ایمانداری اور راستبازی کا رہ گیا ہے وہ بھی مجبور ہو رہا ہے کہ یا تو جھوٹا اور جعل ساز اور رشوت گزار بن جائے، یا پھر کاروبار چھوڑ دے۔ پھر جو کچھ لوگوں سے ٹیکسوں کی شکل میں وصول کیا جاتا ہے اس کا ایک بہت بڑا حصہ پبلک کے حقیقی مفاد پر خرچ ہونے کے بجائے ناروا طور پر اڑایا جا رہا ہے۔ میرا اندازہ ہے کہ اس دولت کا بمشکل ۱۰ فیصدی حصہ ہی اپنے اصل مصرف میں صرف ہوتا ہے۔ باقی ۹۰ فیصدی یا تو غیر قانونی طور پر غبن اور خیانت کی نذر ہوتا ہے یا قانونی طور پر دفتری حکومت کے اونچے اونچے مشاہروں اور حکومت کے ٹھاٹھ جمانے میں کھپ جاتا ہے۔ ممکن ہے کہ میرے اس اندازے کو مبالغے پر مبنی قرار دیا جائے مگر جن لوگوں کو مختلف محکموں کے اندرونی معاملات سے کچھ بھی قریبی واقفیت ہے وہ اس اندازے میں مجھ سے اتفاق کریں گے۔

ملک کی تعمیر و ترقی کے لیے جو کچھ کیا اور سوچا جا رہا ہے اس میں ہم کو دو بہت بڑی غلطیاں نظر آتی ہیں۔ ایک یہ کہ ان ساری تجویزوں میں زیادہ تر بیرونی سرمائے پر اعتماد کیا جا رہا ہے اور اس کو یہاں آنے کی دعوت دی جا رہی ہے۔ حالانکہ بیرونی سرمائے سے ایک ملک کو اپنی تعمیر و ترقی میں جتنی مدد ملتی ہے اس سے بہت زیادہ سیاسی اور معاشی نقصان پہنچتا ہے۔ مجھے کوئی مثال ایسی نہیں

غلطی کہ کوئی ملک اِس بلا کو دعوت دینے کے بعد سیاسی مغلوبی میں مبتلا ہونے اور معاشی لوٹ کھسوٹ کا تختۂ مشق بننے سے بچ گیا ہو۔ اور میرے علم میں یہ بات بھی نہیں ہے کہ ہمارے منتظمین ریاست کے پاس کوئی تعویذ ایسا موجود ہے جسے ملک کے گلے میں باندھ دینے سے یہ بلا ہمیں کوئی نقصان نہ پہنچا سکے گی۔
دوسری غلطی جو اس معاملہ میں ہم دیکھ رہے ہیں یہ ہے کہ ذرائع کا بہت بڑا حصہ حقیقی تعمیر و ترقی کے کاموں پر صرف ہونے کے بجائے ایسے کاموں پر صرف ہو رہا ہے جن سے پاکستان اپنی ظاہری شان و شوکت کے اعتبار سے دولت مند ملکوں کی شان سے لگا کھا سکے اور جسے دیکھ کر گھر کے ظاہر پرست اور باہر کے سطح بین لوگ اِس ملک کے سربراہ کاروں کو داد دینے لگیں کہ انہوں نے واقعی اپنے ملک کو ترقی یافتہ ملکوں کی صف میں لا بٹھایا ہے۔ یہ روش میری نگاہ میں اُتنی ہی غلط ہے جتنی کسی ایسے قلیل المعاش آدمی کی روش غلط ہو سکتی ہے جو اپنی مالی حیثیت سے بڑھ کر ٹھاٹھ جمانے اور امیروں جیسا نظر آنے کی کوشش کرے۔ ایک فرد جب ایسا کرتا ہے تو لوگ اس کو بیوقوف سمجھتے ہیں۔ کوئی صاحبِ عقل انسان اُس شخص کو داد نہیں دیتا جو اپنی اور اپنے گھر والوں کی حقیقی ضروریات فراہم کرنے کے بجائے اپنی قلیل آمدنی کو ڈرائنگ روم کی سجاوٹ پر صرف کرے اور پچاس روپے کی آمدنی رکھتے ہوئے پانچ سو روپے والے کی طرح بن کر دکھائے پھر ایک قوم کے معاملہ میں اِسی طریقہ کو آخر دانشمندانہ کیسے کہا جا سکتا ہے؟

سیاسی حالت اب ذرا ملک کی سیاسی حالت پر ایک نگاہ ڈالیے۔ میں بغیر کسی لاگ لپیٹ کے یہ بات صاف صاف کہہ دینا چاہتا ہوں کہ اِس وقت جو حالات یہاں پلے جلتے ہیں وہ ملک کو انارکی اور ڈکٹیٹر شپ کی طرف لیے جا رہے ہیں۔ جن لوگوں کے ہاتھ میں ملکی سیاست کی باگیں ہیں انہوں نے محض اپنی شخصی اور جماعتی خود غرضی کی بنا پر یہاں جمہوریت کا گلا گھونٹ دیا ہے۔
انہوں نے طرح طرح کے قانونی اور غیر قانونی ہتھیاروں سے کام لے کر یہاں آزاد اخبار نویسی کا قریب قریب خاتمہ کر دیا ہے۔ اب یہاں کوئی آزاد اخبار، یا برسرِ اقتدار پارٹی پر تنقید کرنے والا اخبار، جی نہیں سکتا۔ صرف وہی اخبار پھل پھول سکتے ہیں جو خوشامد کریں، سچ کو چھپائیں، جھوٹ پھیلائیں، اور اس حد تک بے ضمیر و بندۂ شکم ہو جائیں کہ عالمِ بالا سے آئے ہوئے "الہامات" کو اپنے مقالات کی شکل میں

شائع کرنے سے بھی انکار نہ کر سکیں۔ جو لوگ اس کھلی بے ایمانی کے لیے تیار نہ ہوں ان کے اخبار اول تو نکل ہی نہیں سکتے، اور اگر کسی نہ کسی طرح نکل آئیں تو زیادہ دیر تک چل نہیں سکتے۔

انہوں نے خبر رسانی کے ذرائع پر بھی مخفی اور ظاہر طریقوں سے اپنا قبضہ قائم کر رکھا ہے۔ ان کی پوری کوشش یہ ہے کہ ملک کے اندر اور باہر صرف انہی کے مطلب کی خبریں شائع ہوں۔ دوسری تمام خبروں کا وہ پوری پابندی کے ساتھ بلیک آوٹ کرتے اور کراتے ہیں۔

انہوں نے ریڈیو کو ـــــ جو ایک پبلک ادارہ ہے اور پبلک کے خرچ پر چل رہا ہے ـــــ صرف اپنی پارٹی کا اجارہ بنا لیا ہے۔ جس آواز کو وہ اپنی اغراض کے مطابق پاتے ہیں صرف وہی ان نشرگاہوں سے بلند ہو سکتی ہے۔ دوسری کوئی آواز آج تک اس سے نہ سنی گئی ہے نہ سننے کی توقع کی جا سکتی ہے۔ آزاد ملکوں کے ریڈیو پر آپ حکمراں پارٹی اور مخالف پارٹیوں کی خبریں اور خیالات یکساں طور پر سنتے ہیں۔ وہاں انتخابات میں اگر ملک کا صدر یا وزیر اعظم ریڈیو پر تقریر کرتا ہے تو اس کی مخالف پارٹی کا لیڈر بھی اسی طرح آزادی کے ساتھ اپنی بات کہتا اور کہہ سکتا ہے۔ لیکن یہاں کی نشرگاہوں کے قریب بھی کوئی ایسا شخص نہیں بھٹک سکتا جو ملک کے حکمرانوں کا معتوب ہو۔ بلکہ ہمارا ریڈیو پبلک کے خرچ پر ملک کی آبادی کو ہر وقت یہ باور کرانے میں مشغول رہتا ہے کہ اس ملک میں برسر اقتدار پارٹی کے لیڈروں کے سوا سرے سے کوئی اور پایا ہی نہیں جاتا۔

انہوں نے سیفٹی ایکٹ اور سیفٹی آرڈی نینس اور فرنٹیر کرائمز ریگولیشنز، اور ۱۸۱۸ء کے بنگال ریگولیشن تھرڈ اور ایسے ہی دوسرے جابرانہ قوانین کے ذریعہ سے شہری آزادیوں کو تقریباً معدوم کر دیا ہے۔ یہ قوانین ملک کی حفاظت کے لیے تو نہ پہلے درکار تھے، نہ آج درکار ہیں اور نہ درحقیقت ایسے اندھے جابرانہ قوانین کسی ملک کی حفاظت کے لیے کبھی درکار ہوا کرتے ہیں۔ پہلے انگریز ان قوانین کو اس لیے استعمال کر رہا تھا کہ اس ملک میں اس کے خلاف کوئی آزادی کی تحریک اٹھنے اور منظم ہونے نہ پائے۔ اور اب ہمارے برسر اقتدار لیڈر خود اپنی قوم میں جبر کے ان ہتھیاروں کو اس لیے استعمال کر رہے ہیں کہ یہ قوم کبھی اپنے لیڈر تبدیل کرنے کے قابل نہ ہو سکے۔ یہاں کوئی ایسی آواز زیادہ دیر تک برداشت نہیں کی جاتی جس سے یہ اندیشہ ہوتا ہے کہ

اگر اس نے قبول عام حاصل کر لیا تو قوم کی رائے اپنے موجودہ حکمرانوں کے حق میں نہ رہے گی اور وہ ان کی جگہ دوسرے آدمیوں کو لے آنے پر آمادہ ہو جائے گی۔ بالفاظِ دیگر اب صورتِ حال یہ ہے کہ جو لوگ ایک دفعہ قوم کی رضامندی سے اس کے کندھوں پر سوار ہوئے تھے وہ اب اپنی سواری کو اس کی رضامندی پر منحصر نہیں رکھنا چاہتے بلکہ لگام اور چابک کے زور سے اس پر مستقلاً سوار رہنا چاہتے ہیں تاکہ اگر وہ انہیں اتارنا بھی چاہے تو نہ اتار سکے۔

انہوں نے تمام سرکاری ملازمین کو اپنی پارٹی کے والنٹیروں میں اور تمام سرکاری محکموں کو اپنی پارٹی کی شاخوں میں تبدیل کر لیا ہے۔ یہ ملازمین تنخواہ پبلک کے خزانے سے پاتے ہیں اور کام ان سے وہ لیا جاتا ہے جو دراصل مسلم لیگ کے والنٹیروں کو کرنا چاہیے۔ ان محکموں کا خرچ ملک کا خزانہ برداشت کرتا ہے اور ان سے کام اس طرح لیا جاتا ہے گویا کہ وہ بھی مسلم لیگ کی کوئی شاخ ہیں۔ جو لوگ برسرِ اقتدار سیاسی پارٹی سے اختلاف رکھتے ہیں آج ان کی ڈاک سنسر کی جا رہی ہے، ان کے تار روکے جا رہے ہیں، سی آئی ڈی کے بے شمار آدمی ان کا پیچھا کرنے میں لگے ہوئے ہیں، سرکاری محکموں اور ان کے ملازمین کا بہت سا وقت اور روپیہ ان کی نگرانی اور ان کی مزاحمت اور ان کے خلاف پروپیگنڈا کرنے میں صرف ہو رہا ہے، پولیس اور مجسٹریٹوں اور حکامِ مال اور دوسرے سرکاری محکمے کو ان کے مقابلے میں اس طرح استعمال کیا جا رہا ہے کہ گویا وہ سب برسرِ اقتدار سیاسی پارٹی کے ملازم ہیں اور ان کا کام اس ملک کے اندر ہر اُس دوسری جماعت کو دبانا اور روکنا اور کچلنا ہے جو اس سیاسی پارٹی کی مخالف ہو۔ میں پوچھتا ہوں کہ سرکاری ملازمین اور سرکاری محکموں اور سرکاری روپے کے اس استعمال کو کیسے جائز ثابت کیا جا سکتا ہے؟ کیا مسلم لیگ اور پاکستان ایک چیز ہیں؟ کیا مسلم لیگ اور ریاست ہم معنی ہیں؟ کیا ہر وہ شخص جو مسلم لیگ سے اختلاف کرے ملک کا باغی اور دشمن ہے؟ کیا یہاں مسلم لیگ کے سوا کسی کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ اپنے ملک کی بھلائی کے لیے اپنی صواب دید کے مطابق کام کر سکے؟ اور کیا آئین و قانون کی نگاہ میں مسلم لیگ اور دوسری پارٹیوں کی حیثیت یکساں نہیں ہے؟ اگر ان سوالات کا جواب اثبات میں نہیں دیا جا سکتا ——— اور کون ہے جو اپنا بھاری کے ساتھ ان کا جواب اثبات

میں دے سکتا ہو؟ ـــــ تو کیا حق پہنچتا ہے ایک سیاسی پارٹی کو کہ وہ برسرِ اقتدار آکر ملک کی دوسری پارٹیوں کے خلاف پبلک کے ملازمین اور پبلک کے محکموں اور پبلک کے روپے کو اس طرح استعمال کرے؟ کیا یہ کھلی خیانت نہیں ہے جس کا ارتکاب روزِ روشن میں اتنے بڑے پیمانے پر کیا جارہا ہے؟ کیا اب یہاں یہ اصول چلیگا کہ ملک کی جو پارٹی بھی ایک دفعہ برسرِ اقتدار جائے وہ خود اقتدار پر قابض رہنے اور دوسروں کا راستہ روکنے کے لیے حکومت کی طاقت اور اس کے ذرائع سے کام لیا کرے؟

سب سے زیادہ خطرناک حرکت جو یہ لوگ کر رہے ہیں وہ یہ ہے کہ انہوں نے انتخابات کو اس ملک میں بالکل دھن، دھونس، دھوکے اور دھاندلی کا کھیل بنا کر رکھ دیا ہے اور اس کھیل میں یہ حکومت کے اختیارات اور ذرائع کو کھلم کھلا استعمال کر رہے ہیں۔ یہ صرف ایک بددیانتی ہی نہیں ہے بلکہ صریحاً ملک کی تخریب ہے۔ یہ ایک سخت حماقت ہے جس کے خوفناک نتائج کا شاید انہیں اندازہ نہیں ہے۔ یہ اس ملک کے ساتھ سب سے بڑی غداری، بدخواہی اور دشمنی ہے کہ یہاں کے لوگوں کو جمہوری و آئینی ذرائع سے مایوس کر دیا جائے اور انہیں یقین دلایا جائے کہ یہاں اب جو سیاسی تغیر بھی ہوگا غیر آئینی اور غیر جمہوری طریقوں سے ہی ہو سکے گا۔

ہر شخص جو کچھ بھی عقل و بصیرت رکھتا ہے، اس بات کو سمجھ سکتا ہے کہ تغیر کو روکنا تو کسی انسانی طاقت کے بس میں نہیں ہے۔ اس لیے کہ وہ فطرت کے ناگزیر تقاضوں میں سے ایک ہے اور دنیا کے ہر شعبۂ زندگی کی طرح سیاسی نظام میں بھی اُس کا آنا لازمات میں سے ہے۔ جمہوری انتخابات کا اصل فائدہ یہ ہے کہ وہ فطرت کے اس تقاضے کو ایک پُرامن اور معقول راستہ فراہم کر دیتے ہیں جس سے وہ بغیر کسی الٹ پلٹ اور اکھیڑ پچھاڑ کے ایک غیر مقبول نظام کی جگہ دوسرا نسبتہً زیادہ مقبول نظام لے آتا ہے اور ملک کے ارتقاء میں کوئی فساد انگیز خلل برپا نہیں ہونے پاتا۔ اگر یہ راستہ کھلا نہ ہو تو فطرت اپنے تقاضوں کی تکمیل کے لیے پھر انقلاب کے وہ راستے کھولتی ہے جن سے بادشاہتوں اور مطلق العنان حکمرانیوں کے تختے الٹتے رہے ہیں اور آج بھی الٹ رہے ہیں

اور جن کی بدولت قوموں کے مزاج بسا اوقات ایسے بگڑے ہیں کہ صدیوں تک سنبھلنے نہ پائے ہیں۔ جمہوری انتخابات ہمیں اِس پُرخطر راستے پر جانے سے بچا لیتے ہیں۔ لیکن اُن کا یہ حقیقی فائدہ ہم کو صرف اسی صورت میں حاصل ہو سکتا ہے جبکہ ہمارے ہاں انتخابات بالکل ایمانداری کے ساتھ آزادانہ فضا میں ہوں۔ قوم کے ہر عنصر کو یکساں اور پورا موقع حاصل ہو کہ وہ اپنے خیالات اور پروگرام عوام الناس کے سامنے پیش کرے۔ عوام الناس کو بے لاگ طریقہ سے یہ موقع دیا جائے کہ وہ ہر ایک کی بات سنیں، سمجھیں، اور خود فیصلہ کریں کہ کس کا پروگرام ان کے نزدیک درست اور مفید ہے۔ پھر جو شخص جس کے حق میں بھی اپنا ووٹ استعمال کرنا چاہے، کسی دباؤ اور لالچ کے بغیر آزادی کے ساتھ استعمال کرے۔ رائے شماری میں کسی دھاندلی سے کام نہ لیا جائے اور باشندگانِ ملک کی واقعی اکثریت جس کے حق میں بھی ہو اس کے سپرد ملک کا انتظام کر دیا جائے۔ یہ شرطیں پوری ہوں تو انتخاب کے نافذ کرنا، دونوں یکساں ہیں۔ اب دیکھیے کہ آپ کے ملک میں انتخابات کس ڈھب سے ہو رہے ہیں۔

یہاں انتخاب کا پہلا مرحلہ اس طرح طے ہوتا ہے کہ مخالف پارٹیوں کو پریس کی طاقت سے بالکل یا بڑی حد تک محروم کر دیا جاتا ہے۔ اپنے زیر اثر اخبارات کے ذریعے سے ان کے خلاف جھوٹ کی ایک ہمہ گیر مہم چلائی جاتی ہے۔ خبر رسانی کے ذرائع نہ صرف ان کا بائیکاٹ کرتے ہیں بلکہ ان کی طرف غلط خبریں منسوب کر کے پھیلاتے ہیں۔ نئے نئے بہتان تراش تراش کر ان کے سر تھوپے جاتے ہیں۔ مولویوں اور پیروں کی خدمات حاصل کی جاتی ہیں اور روپے دے دے کر ان سے خطرے کی گھنٹیاں بجوائی جاتی ہیں۔ اصل مسائلِ زندگی سے لوگوں کی توجہ ہٹا کر طرح طرح کے مذہبی اور غیر مذہبی جھگڑے کھڑے کیے جاتے ہیں۔ اور پوری کوشش کی جاتی ہے کہ عوام الناس کو جتنا دھوکا دیا جا سکتا ہے دیا جائے اور انہیں بے لاگ طریقے سے صاف فضا میں کچھ سوچنے اور سمجھنے کے قابل نہ چھوڑا جائے۔

اس کے بعد انتخابات کے دوسرے مرحلے کی مہم اس طرح سر کی جاتی ہے کہ رائے دہندوں کی فہرستوں میں ہزارہا جعلی ووٹروں کے نام درج کرائے جاتے ہیں اور ہزارہا اصلی ووٹروں کے

نام ساقط کرا دیے جاتے ہیں۔ یہ خدمت سرکاری عملے سے لی جاتی ہے۔ اور پھر اس خرابی کی اصلاح کے لیے چاہے کوئی کتنا ہی شور مچائے، اس کی طرف ذرا توجہ نہیں کی جاتی۔

پھر انتخاب کی تیسری مہم یوں سر ہوتی ہے کہ صاف صاف حکم دے کر مجسٹریٹوں سے اپنے مخالفین کے کاغذات نامزدگی نامنظور کرائے جاتے ہیں۔ اپنے خاص خاص آدمیوں کو بلا مقابلہ منتخب کرایا جاتا ہے۔ اور مخالف پارٹیوں کے با اثر آدمیوں کو عین وقت پر گرفتار کر لیا جاتا ہے۔

اس کے بعد پولیس اور پٹواریوں اور نمبرداروں اور محکمۂ مال کے افسروں اور بسا اوقات ڈپٹی کمشنروں تک کے ذریعہ سے رائے دہندوں کو کھلم کھلا ڈرانے، دھمکانے اور لالچ دلانے کا سلسلہ شروع ہوتا ہے تاکہ وہ برسرِ اقتدار پارٹی کے امیدواروں کو ووٹ دیں۔ بعض مقامات پر خود پولیس کے ذریعہ سے رائے دہندوں میں روپیہ تک تقسیم کیا گیا ہے اور یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے جو علاقے کے لوگوں کو معلوم نہ ہو۔ رہے سرکاری ملازم، تو نہ صرف وہ خود بلکہ ان کے رشتہ دار تک برسرِ اقتدار پارٹی کو ووٹ دینے کے پابند ہیں اور بارہا یہ مثالیں ہمارے سامنے آچکی ہیں کہ تھانہ داروں اور نمبرداروں کے ذریعہ سے لوگوں کو یہ دھمکی دی گئی ہے کہ اگر تمہارا ووٹ سرکار (یعنی مسلم لیگ) کے خلاف گیا تو اپنے بیٹے یا بھائی یا داماد کو ملازمت سے برخاست سمجھو۔

پھر اصل انتخاب کا موقع آتا ہے اور اس وقت کوئی قسم بے ایمانی کی ایسی نہیں ہوتی جو نہ کی جاتی ہو۔ ہزارہا کرائے کے آدمی لاریوں اور ٹرکوں میں بھر بھر کر لائے جاتے ہیں اور وہ علی الاعلان پولیس اور پریزائیڈنگ افسروں کے سامنے جعلی ووٹ ڈالتے ہیں اور اعتراض کرنے والوں کی کوئی نہیں سنتا۔ ایک ایک شخص پندرہ پندرہ اور بیس بیس مرتبہ مختلف ناموں سے آتا ہے اور ووٹ ڈالتا ہے اور فی ووٹ ایک مقرر رقم حاصل کر لیتا ہے۔ پنجاب میں ایک مثال ایسی بھی دیکھی گئی کہ ایک شخص نے ۵۱ مرتبہ ووٹ ڈالا۔ حد یہ ہے کہ قوم کی بیٹیوں تک کو یہ سکھایا جاتا ہے کہ وہ کبھی کسی کی بیوی بن کر ووٹ ڈالیں اور کبھی کسی کی بیٹی بن کر۔ یہ کام اسکولوں اور کالجوں کی

لڑکیوں تک سے پینے میں شرم نہیں کی جاتی اور کچھ نہیں سوچا جاتا کہ ہم اپنی قوم کی لڑکیوں کو یہ کیسے اخلاق سکھا رہے ہیں۔ پھر جو سرکاری عملہ پولنگ اسٹیشنوں پر مقرر کیا جاتا ہے وہ اپنے پیٹ کی خاطر "اپنی سرکار" کو جتانے کے لیے ہر طرح کے جتن کرتا ہے۔ لوگوں سے جبراً "مسلم لیگ" کے بکس میں پرچی ڈلوانا، مخالف پارٹی کے بکسوں میں ڈالنے والوں سے پرچیاں چھین لینا، ایک بکس کو توڑ کر اس کی پرچیاں دوسرے بکس میں ڈال دینا، یہ کوئی شاذ و نادر واقعات نہیں ہیں، بلکہ بڑے پیمانے پر دیکھے گئے ہیں اور دیکھے جا رہے ہیں۔

یہ ہیں وہ "جمہوری انتخابات" جو اس ملک میں ہو رہے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ ایسے انتخابات منعقد کرنے کا فائدہ کیا ہے؟ کیا ایسے ہتھکنڈوں سے جیتنے والوں کے متعلق پبلک یہ سمجھ سکتی ہے کہ وہ فی الواقع اُس کے حقیقی نمائندے ہیں جو اُس کی آزاد مرضی سے منتخب ہوئے ہیں؟ کیا ایسے ہتھکنڈوں سے جیتنے والے خود اپنی جگہ یہ سمجھ سکتے ہیں کہ وہ اپنی خدمات اور اپنے پروگرام سے عوام کو مطمئن کر کے برسر اقتدار آئے ہیں اور آئندہ ان کے پھر برسر اقتدار آنے کا انحصار خدمت اور پروگرام کی صحت ہی پر ہے، دھوکے اور دھاندلی اور دھونس اور دھن پر نہیں ہے؟ اور کیا ایسے ہتھکنڈوں سے ہارنے والے یہ سوچ کر مطمئن ہو سکتے ہیں کہ ان کے ہارنے کی اصل وجہ عوام میں ان کے کام اور پروگرام کا غیر مقبول ہونا ہے اور آئندہ اگر وہ زیادہ مقبولیت حاصل کر لیں تو وہ انتخابات میں کامیاب ہو سکتے ہیں؟ میں سمجھتا ہوں کہ کوئی صاحبِ عقل آدمی جو ان حالات سے واقف ہو اِن میں سے کسی سوال کا جواب بھی اثبات میں نہیں دے سکتا۔ پھر یہ کیسے امید کی جا سکتی ہے کہ ہمارے ملک میں انتخابات فطرت کی تغیر پسندی کو غیر آئینی انقلابات کے راستے پر جانے سے روک سکیں گے اور پُرامن ارتقا کے راستے پر ڈال سکیں گے؟

مَیں نے انتہائی تشویش کے ساتھ یہ بات دیکھی ہے کہ ہر انتخابی تجربے کے بعد جمہوری طریقوں سے لوگوں کی مایوسی پہلے سے زیادہ بڑھ گئی ہے۔ پنجاب کے انتخاب کے بعد متعدد نوجوان مجھے ایسے ملے جو کہتے تھے کہ یہاں جمہوری طریقوں سے کوئی تغیر نہیں ہو سکتا۔ پھر سرحد کے تجربے نے

اس طرح سوچنے والوں کی تعداد اور زیادہ بڑھا دی۔ میں ان باتوں کو سنتا ہوں اور اس ملک کے تاریک مستقبل کا تصور کرکے میری روح کانپ جاتی ہے۔ کیونکہ میں جانتا ہوں کہ کسی ملک کے نوجوانوں میں ایسے احساسات پیدا ہو جانے کے معنی کیا ہیں۔ اسی بنا پر میں پوری دلسوزی کے ساتھ ارباب اقتدار سے کہتا ہوں کہ خدارا اپنے ملک کو اس تباہی کے راستے کی طرف نہ دھکیلیے۔ اس میں نہ ہماری خیر ہے۔ نہ آپ کی خیر ہے، نہ اس ملک کی خیر ہے!

دستور کا مسئلہ آخر میں ایک نہایت اہم مسئلہ ملک کے دستور کا ہے جو چار سوا چار سال سے ٹل رہا ہے۔

اس معاملہ میں ہمارے ارباب اقتدار کی روش ایک مستقل وجہ تشویش بنی ہوئی ہے۔ وہ ابتدا سے ملک کا دستور ملک کے باشندوں کی تمناؤں اور آرزوؤں کے بجائے اپنی مرضی کے مطابق بنانے پر تلے رہے ہیں پہلے انیس مہینے تک وہ اسی بات کو ٹالتے رہے کہ اسلام کو دستور کی بنیاد قرار دینے کا سرکاری طور پر اعلان کریں۔ پھر جب لوگوں نے ہر طرف سے مطالبہ کیا تو مجبوراً قرارداد مقاصد پاس کی لیکن اس کے بعد ملک کے نظم و نسق میں اور حکومت کی پالیسی میں کوئی جزوی سے جزوی تغیر بھی ایسا نہیں کیا گیا جس سے معلوم ہوتا کہ فی الواقع یہ لوگ ملک کے نظام کو ان اصولوں پر ڈھالنا چاہتے ہیں جو قرارداد مقاصد میں بیان کیے گئے ہیں۔ جیسا کہ میں اس سے پہلے اپنی ایک تقریر میں کہہ چکا ہوں، یہ قرارداد ایک انوکھی بارش تھی کہ نہ اس سے پہلے کوئی گھٹا اٹھی اور نہ اس کے بعد کسی قسم کی روئیدگی ہوئی۔ اگر حقیقت میں ان کے اپنے مقاصد بھی وہی ہوتے جو انہوں نے اس قرارداد میں بیان کیے تھے تو اس سے پہلے کچھ آثار ایسے پائے جانے چاہییں تھے جو پتہ دیتے کہ اسلامی نظام زندگی کو برپا کرنے کے لیے ملک کے سربراہ کاروں میں کوئی رجحان پیدا ہو رہا ہے۔ لیکن بارش سے پہلے اس طرح کی کوئی گھٹا اٹھتی نہ دیکھی گئی۔ پھر کم از کم اتنا ہی ہونا چاہیے تھا کہ قرارداد پاس کر لینے کے بعد حکام کے رویہ میں، حکومت کی پالیسی میں، ۱۹۳۵ء کے ایکٹ کی دفعات میں، ملک کے قوانین میں، تعلیم کے نظام میں، سول سروس وغیرہ کے طریق تربیت میں، اور

فوج کے طور طریقوں میں اسلام کے منشا کے مطابق کوئی تبدیلی رونما ہونی شروع ہو جاتی۔ مگر اس اتفاقی بارش کے بعد ایسی کوئی روئیدگی بھی کسی طرف اُبھرتی نظر نہ آئی۔ بس ایک جادو کی سی برسات تھی جو مداری نے لوگوں کے مطالبے پر اچانک برسادی۔

مارچ ۱۹۴۹ء سے ستمبر ۱۹۵۰ء تک پورے ۱۹ مہینے پھر اس انتظار میں گزر گئے کہ قرارداد مقاصد کی تفسیر ایک تفصیلی دستور کی شکل میں کیا پیش کی جاتی ہے۔ آخر کار وہ سفارشات ہمارے سامنے آئیں جو بنیادی حقوق اور بنیادی اصولوں کے متعلق دستور ساز اسمبلی کی مقرر کردہ کمیٹیوں نے مرتب کی تھیں۔ انہیں دیکھ کر سارا ملک حیران رہ گیا کہ وہ دراصل قرارداد مقاصد کی تفسیر نہیں بلکہ عملاً اس کی تنسیخ تھیں۔ ان میں اسلام اور جمہوریت دونوں ہی پر کچھ اس بیدردی کے ساتھ چھری چلائی گئی تھی کہ ملک کے سارے گروہ اس پر چیخ اٹھے۔ علماء، اور سیاسی لیڈر، اخبارات اور عوام، اور خود مسلم لیگ کے بہت سے ایماندار لوگ، غرض سب ہی نے بالاتفاق ان سفارشات کو غیر اسلامی اور غیر جمہوری قرار دیا۔ اوّل اوّل پوری کوشش کی گئی کہ انہیں عین اسلام اور عین جمہوریت ثابت کیا جائے۔ مگر جب دیکھ لیا گیا کہ پاکستان کے لوگ آنکھوں دیکھتے یہ جیتی مکھی نہیں نگل سکتے تو معاملہ پھر کمیٹیوں کے حوالہ کر دیا گیا جس پر آج چودہ مہینے گزر چکے ہیں۔

اب سنا جا رہا ہے کہ "عالم بالا" میں پھر اسی طرح کی ایک نئی سازش کی ضرورت محسوس کی جا رہی ہے جیسی ۱۹۴۸ء میں نظام اسلامی کے مطالبے کو روکنے کے لیے کی گئی تھی۔ اس وقت یہ گمان کیا گیا تھا کہ نظام اسلامی کا مطالبہ محض چند اشخاص کا اٹھایا ہوا ہے، انہیں پکڑ کر قید کر دیا جائے تو پھر کوئی اس سوال کو اٹھانے والا نہ رہے گا۔ چنانچہ ایک پوری بنی ہوئی سازش کے ساتھ کشمیر کے معاملہ میں ایک سراسر جھوٹا الزام گھڑ کر ایک شخص پر چسپاں کیا گیا اور اسے اور اس کے ساتھیوں کو قید کر دیا گیا۔ مگر یہ اندازہ غلط ثابت ہوا اور اس تدبیر کے باوجود بھی کچھ کرنا پڑا جو اس کے بغیر کرنا پڑتا۔ اب پھر یہ غلط اندازہ کیا جا رہا ہے کہ اپنے حسب منشا دستور بنا کر نافذ کرنے میں اگر کوئی ان کی راہ کا رخنہ بن سکتا ہے تو وہی چند اشخاص ہیں۔ چنانچہ ان کو ہٹانے

کے لیے پھر کچھ تدبیریں سوچی جارہی ہیں۔ مجھے ان تدبیروں کی تو کوئی پروا نہیں ہے جس کا جی چاہے انہیں پھر آزما کر دیکھ لے۔ البتہ سراسر خیر خواہی کی بنا پر میں ان لوگوں سے ایک بات صاف صاف کہہ دینا چاہتا ہوں۔ اور وہ یہ ہے کہ حضرات! اگر آپ لوگ سیدھی سیدھی طرح ایمانداری سے خدا کے دین کی خدمت کریں تو ہم سے زیادہ آپ کا ہمدرد اور مددگار کوئی نہ ہوگا۔ ہم اس کام میں اپنی کوئی غرض نہیں رکھتے۔ ہماری یہ خواہش ہرگز نہیں ہے کہ آپ اقتدار کی مسند سے ہٹیں اور ہم آپ کی جگہ لیں ہم صرف یہ چاہتے ہیں کہ خدا کے دین کو اس کی اصلی شکل اور روح میں از سرِ نو قائم کیا جائے۔ یہ کام آپ کریں تو ہم آپ کے لیے ایک ادنیٰ چپراسی کی خدمت انجام دینا بھی اپنے لیے باعثِ سعادت سمجھیں گے۔ لیکن اگر آپ اس کے برعکس کوئی دوسرا نظام یہاں لانا چاہیں تو آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ یہاں کچھ لوہے کے چنے ایسے موجود ہیں جن کو چبانے کی کوشش میں دانت تو ٹوٹ سکتے ہیں مگر وہ چَب نہیں سکتے۔

اسباب

یہ ملک کے موجودہ حالات پر میرا تبصرہ ہے۔ اگر حالات فی الواقع اس سے کچھ بہتر ہوں اور میرے اس تبصرے میں سے کوئی چیز بھی واقعات کے لحاظ سے غلط ثابت ہو جائے تو مجھ سے بڑھ کر کسی کو خوشی نہ ہوگی۔ کیونکہ میری تو دلی خواہش یہ ہے کہ یہ خرابیاں یہاں موجود نہ ہوں۔ لیکن مجھے اندیشہ ہے کہ جو شخص بھی حالات کا گہری نظر سے جائزہ لے گا وہ اس تبصرے کو مبالغہ آمیز نہیں بلکہ حقیقت نفس الامری سے کچھ کم ہی پائے گا۔

اب میں مختصر طور پر یہ بتاؤں گا کہ ان خرابیوں کے اسباب کیا ہیں، کیونکہ اسباب کو سمجھے بغیر علاج ممکن نہیں ہے۔

ان کا پہلا اور بنیادی سبب دلوں کا بالعموم خوفِ خدا اور فکرِ آخرت سے خالی ہو جانا ہے۔ یہی چیز ہے جس نے لوگوں کو شتر بے مہار بنا دیا ہے، سیرت و اخلاق کی جڑیں کھوکھلی کر دی ہیں، اور زندگی کے ہر شعبے میں اس کے برے اثرات ظاہر ہو رہے ہیں۔ جس آدمی کے دل میں خدا کا خوف نہ ہو اور جسے

یہ احساس نہ ہو کہ اُسے کبھی اپنے خدا کے سامنے حاضر ہو کر اپنے اعمال کا حساب بھی دینا ہے، وہ صرف نماز اور روزے سے ہی غفلت نہ کریگا، بلکہ آپ کسی معاملے میں بھی اس سے دیانت، امانت، راستبازی اور اخلاص کی امید نہیں رکھ سکتے۔ دوسری قومیں تو خیر، سیرت کے لیے دوسری بنیادیں تلاش کر لیتی ہیں جن پر ان کے ہاں اخلاق کی عمارت کسی نہ کسی حد تک استوار ہو جاتی ہے۔ مگر مسلمان تو جب تک بالکل ہی کافر نہ ہو جائے، خوفِ خدا اور فکرِ آخرت کے سوا سیرت و اخلاق کے لیے کوئی دوسری بنیاد سرے سے پا ہی نہیں سکتا۔ اور یہ بنیاد کھو دینے کے بعد وہ نہ دین کا رہتا ہے نہ دنیا کا۔

دوسرا سبب عوام کی جہالت ہے جس سے ہماری اپنی ہی قوم کے مخصوص طبقے طرح طرح کے ناجائز فائدے اٹھا رہے ہیں۔ مذہبی فتنے اٹھتے ہیں تو اسی جہالت کی بدولت، اور سیاسی غلط کاریاں پھلتی پھولتی ہیں تو اسی کے بل بوتے پر۔ ایک جمہوری نظام جس میں اقتدار کا سرچشمہ عوام کی رائے ہو کبھی صحیح طور پر نہیں چل سکتا جب تک کہ عوام کی اکثریت بھلے اور برے کی تمیز سے آشنا اور معاملات کو سمجھنے کے قابل نہ ہو۔ یہ حالت جب تک رہیگی ہر انتخاب کے موقع پر تمام وہ طبقے جن کا مفاد موجودہ بگاڑ سے وابستہ ہے، مل جل کر عوام کی اکثریت کو فریب اور خوف اور لالچ سے متاثر کرتے رہیں گے اور پھر اقتدار پر قابض ہو کر اصلاح کی ہر کوشش کو ناکام اور بگاڑ کی ہر تدبیر کو کامیاب بناتے رہیں گے۔

تیسرا بڑا سبب ہماری قوم کے تعلیم یافتہ طبقے کی بے حسی، نا فرض شناسی، اور ملک کے مستقبل سے بے پروائی ہے۔ اُن میں سے جو اہلِ قلم ہیں، وہ اکثر و بیشتر آج اپنی ذاتی اغراض کی خاطر یا تو اپنی قوم کو گمراہ کرنے میں لگے ہوئے ہیں، یا پھر اربابِ نشاط بن کر رہ گئے ہیں۔ جو سرکاری ملازمت میں ہیں، ایک عنصرِ قلیل کے سوا، انہوں نے تنخواہوں کے عوض اپنا ضمیر بیچ ڈالا ہے اور اپنے آپ کو اس طرح اربابِ اقتدار کے حوالے کر دیا ہے کہ وہ جس طرح چاہیں آئین اور انصاف کے خلاف ان سے اپنی خواہشات کے مطابق کام لے سکتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ "ضمیر" نام کی کوئی چیز ان کے سینوں میں کہیں موجود ہی نہیں ہے۔ رہے عام تعلیم یافتہ لوگ تو ان کی بے حسی کا اندازہ اس سے

کر دیکھیے کہ پنجاب کے پچھلے انتخابات میں، جبکہ پانچ سال کے لیے صوبے کی قسمت کا فیصلہ ہو رہا تھا، اُن کی بمشکل ۲ فیصدی آبادی ووٹ دینے کے لیے آئی، اور عوام کی رائے کو تیار کرنے میں تو ان کے ½ فی صدی حصے نے بھی مشکل ہی سے کوئی دلچسپی لی ہوگی۔ باقی سب کے سب اس سوال سے بالکل بے پروا تھے کہ کن لوگوں کے ہاتھ میں آئندہ پانچ سال کے لیے صوبے کے انتظام کی باگیں دی جاتی ہیں۔ گویا یہ انتخابات ان کے ملک میں نہیں بلکہ کہیں اور ہو رہے تھے اور اُن کا کوئی اچھا یا بُرا اثر خود ان کی زندگی پر تو پڑنا ہی نہیں تھا۔ خود دیکھیے کہ جس ملک کے اہل دماغ طبقے کا یہ حال ہو اُس کو تنزّل اور تباہی کی طرف جانے سے کیسے بچایا جا سکتا ہے؟

چوتھا سبب، جو اپنی اہمیت میں دوسرے اسباب سے کچھ کم نہیں ہے، ہمارے علمائے دین کا بالعموم اپنے فرض سے غافل ہونا، بلکہ اپنے منصب کے خلاف کام کرنا ہے۔ ان میں سے بہت کم ہیں جنہیں اس امت کو لگی ہوئی اصلی اور حقیقی بیماریوں کا کچھ احساس اور اُن کے علاج کی کوئی فکر لاحق ہے۔ باقی سب یا تو کسی علامتِ مرض کی جڑ کاٹنے میں لگے ہوئے ہیں، یا اس مریضِ نیم جان کو کچھ مزید عارضے لگانے میں مشغول ہیں، یا پھر وہ اپنا سارا زور بگاڑ کے علمبرداروں کو چھوڑ کر اصلاح کی کوشش کرنے والوں کے خلاف صرف کر رہے ہیں کیونکہ کسی نہ کسی وجہ سے ان کو پہلے گروہ کی بہ نسبت دوسرے گروہ کا وجود زیادہ ناگوار ہے۔

اس حالت کا علاج کیا ہے؟ اور ہم اس کے لیے کیا کر رہے ہیں اور کرنا چاہتے ہیں؟ یہ ایک تفصیل طلب سوال ہے جس پر گفتگو کے لیے آج کی صحبت کافی نہیں ہے۔ اس کا جواب میں اپنی اختتامی تقریر میں دونگا۔

اجتماعِ کراچی کی اختتامی تقریر

[یہ وہ تقریر ہے جو ۱۱ نومبر ۱۹۵۱ء کی شب کو جماعت اسلامی کے اجتماع عام منعقدہ کراچی میں کی گئی تھی]

حمد و ثنا کے بعد :

حاضرین و حاضرات ! مَیں اپنی افتتاحی تقریر میں ملک کی حالت کا تفصیلی جائزہ لے کر یہ بتا چکا ہوں کہ اس وقت یہاں زندگی کے ایک ایک شعبے میں کیا خرابیاں پائی جاتی ہیں اور ان کے اسباب کیا ہیں۔ مَیں نے وعدہ کیا تھا کہ آج کی تقریر میں آپ کو بتاؤں گا کہ ہمارے پاس وہ کیا پروگرام ہے جس سے ہم خود یہ توقع رکھتے ہیں اور آپ کو بھی یہ توقع دلا سکتے ہیں کہ وہ خرابیوں کی اصلاح کا مفید اور کارگر ذریعہ بن سکتا ہے۔ میری آج کی تقریر اسی موضوع سے تعلق رکھتی ہے۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ

لیکن اس پروگرام کو بیان کرنے سے پہلے میں ایک غلط فہمی کو رفع کر دینا چاہتا ہوں جو اس سلسلے میں پیدا ہو سکتی ہے۔ اگر میں موجود الوقت خرابیوں کو اور ان کے موجودہ اسباب کو بیان کرتے کے بعد جماعت اسلامی کا پروگرام پیش کروں، اور اس کے ذریعہ سے آپ کو اصلاح کی امید دلاؤں تو اس سے آپ یہ گمان نہ کریں کہ یہ جماعت شاید کچھ اسی قسم کی وقتی خرابیوں کی اصلاح کے لیے بنی ہوگی اور پرانی عمارتوں میں ایسی ہی کچھ مرمتیں کرتے رہنا اس کا مقصد ہوگا۔ ایسا گمان آپ کریں گے تو وہ حقیقت سے بعید ہوگا۔ واقعہ یہ ہے کہ جماعت اسلامی اپنا ایک مستقل اور عالمگیر مقصد رکھتی ہے، اور وہ یہ ہے کہ

" ہر اس نظامِ زندگی کو مٹایا جائے جس کی بنیاد خدا سے خود مختاری اور آخرت سے

بے پروائی اور انبیاء علیہم السلام کی ہدایت سے بے نیازی ہو، کیونکہ وہ انسانیت کے لیے تباہ کن ہے۔ اور اس کی جگہ وہ نظام زندگی عملاً قائم کیا جائے جو خدا کی اطاعت، آخرت کے یقین اور انبیاء کے اتباع پر مبنی ہو، کیونکہ اسی میں انسانیت کی فلاح ہے۔"

جماعت کی تمام مساعی کا اصل مقصود یہی ہے اور اس کا ہر پروگرام خواہ وہ کسی محدود وقت اور مقام ہی کے لیے کیوں نہ ہو، اسی راہ کے کسی نہ کسی مرحلے کو طے کرنے کے لیے ہوتا ہے ہم سب سے پہلے یہ انقلاب خود اپنے وطن، پاکستان میں لانا چاہتے ہیں تاکہ پھر یہی ملک دنیا کی اصلاح کا ذریعہ بنے۔ اور پاکستان کی موجودہ خرابیوں سے اگر ہم بحث کرتے ہیں تو صرف اس لیے کہ یہ اس مقصد کی راہ میں حائل ہیں۔ لہٰذا آپ یہ گمان نہ کریں کہ ہمارے لیے ان خرابیوں کی اصلاح بجائے خود کوئی مقصد ہے یا یہ کہ ہم ایک بگڑے ہوئے نظام کی محض مرمت کر دینے ہی پر اکتفا کرنا چاہتے ہیں۔ نہیں، میں کہتا ہوں کہ اگر یہ خرابیاں موجود نہ ہوتیں تب بھی ہم اپنے اُسی مقصد کے لیے کام کرتے جس کو اول روز سے ہم نے اپنے سامنے رکھا ہے۔ ہمارا وہ مقصد ایک دائمی اور ابدی اور عالمگیر مقصد ہے اور ہر حالت میں ہمیں اس کے لیے کام کرنا ہے خواہ کسی گوشۂ زمین میں وقتی طور پر ایک نوعیت کے مسائل درپیش ہوں یا کسی دوسری نوعیت کے۔

پچھلی تاریخ کا جائزہ

اس توضیح کے بعد میں ضرورت محسوس کرتا ہوں کہ جس طرح آپ نے وضاحت کے ساتھ اپنے ملک کی موجودہ خرابیوں کا جائزہ لیا ہے اُسی طرح آپ ذرا اپنی پچھلی تاریخ کا بھی جائزہ لے لیں تاکہ اچھی طرح تحقیق ہو جائے کہ آیا یہ خرابیاں اچانک ایک حادثۂ اتفاقی کے طور پر آپ کی سوسائٹی میں رونما ہو گئی ہیں، یا ان کی کوئی گہری جڑ ہے اور ان کے پیچھے اسباب کا کوئی طویل سلسلہ ہے۔ اس پہلو سے جب تک آپ معاملہ کی نوعیت اچھی طرح نہ سمجھ لیں، نہ تو موجودہ خرابیوں کی شدت و وسعت اور گہرائی آپ پر واضح ہو گی، نہ اصلاح کی ضرورت ہی کا احساس پوری طرح ہو سکے گا، اور نہ یہی بات سمجھ میں آسکے گی کہ ہم یہاں جزوی اصلاح کی کوششوں کو لاحاصل کیوں سمجھتے ہیں اور کس بنا پر ہماری

یہ رائے ہے کہ ایک ان تھک سعی اور ایک ہمہ گیر اصلاحی پروگرام اور ایک صالح و منظم جماعت کے ذریعہ سے جب تک یہاں نظامِ زندگی میں اساسی تبدیلیاں نہ کی جائیں گی کوئی مفید نتیجہ چھوٹی موٹی تدبیروں سے برآمد نہ ہو سکے گا۔

ہماری تاریخ کا یہ ایک نہایت اہم اور نتیجہ خیز واقعہ ہے کہ ہمارے ملک پر انیسویں صدی میں ——— اسی پچھلی صدی میں جو موجودہ صدی سے پہلے گزر چکی ہے ——— ہزاروں میل دور سے آئی ہوئی ایک غیر مسلم قوم مسلط ہو گئی تھی اور ابھی تین چار ہی برس ہوئے ہیں کہ اس کی غلامی سے ہمارا پیچھا چھوٹا ہے۔ یہ واقعہ ہمارے لئے کئی لحاظ سے قابلِ غور ہے:

پہلا سوال جس کی ہمیں تحقیق کرنی چاہیے، یہ ہے کہ آخر یہ واقعہ پیش کیسے آگیا؟ کیا وہ کوئی اتفاقی سانحہ تھا جو یونہی بے سبب ہم پر ٹوٹ پڑا؟ کیا وہ قدرت کا کوئی ظلم تھا جو اس نے بے قصور ہم پر کر ڈالا؟ کیا ہم بالکل ٹھیک چل رہے تھے؟ کوئی کمزوری اور کوئی خرابی ہم میں نہ تھی؟ یا فی الواقع ہم اپنے اندر مدتوں سے کچھ کمزوریاں اور کچھ خرابیاں پال رہے تھے جس کی سزا آخر کار ہمیں ایک بیرونی قوم کی غلامی کی شکل میں ملی؟ اگر حقیقت یہی ہے کہ ہم میں کچھ خرابیاں اور کمزوریاں تھیں جو ہماری تباہی کی موجب ہوئیں تو وہ کیا تھیں؟ اور آیا اب وہ ہم میں سے نکل چکی ہیں یا ابھی تک ان کا سلسلہ برابر چلے جا رہا ہے؟

دوسرا سوال یہ ہے کہ یہ بلا جو باہر سے آکر ہم پر مسلط ہوئی، آیا یہ صرف ایک غلامی ہی کی بلا تھی یا وہ اپنے جلو میں اخلاق، افکار، تہذیب، مذہب، تمدن، معیشت، اور سیاست کی دوسری بہت سی بلائیں بھی ساتھ لائی تھی؟ اگر لائی تھی، اور یقیناً لائی تھی، تو دیکھنا چاہیے کہ وہ کس کس نوعیت کی بلائیں تھیں؟ کس کس حیثیت سے انہوں نے ہمیں کتنا کچھ متاثر کیا؟ اور آج اس کے چلے جانے کے بعد بھی ان کے کیا کچھ اثرات ہمارے اندر موجود ہیں؟

تیسرا سوال یہ ہے کہ ان بلاؤں کے مقابلہ میں ہمارا اپنا ردِ عمل کیا تھا؟ آیا وہ ایک ہی ردِ عمل تھا یا مختلف گروہوں کے ردِ عمل مختلف تھے؟ اگر مختلف تھے تو ان میں سے ہر ایک کے اچھے

اور برے کیا اثرات ہیں جو آج ہماری قومی زندگی میں پائے جاتے ہیں۔

میں ان تینوں سوالات پر وضاحت کے ساتھ روشنی ڈالوں گا تاکہ ہماری موجودہ خرابیوں میں سے ہر خرابی کا پورا شجرۂ نسب آپ کے سامنے آجائے اور آپ دیکھ لیں کہ ہر خرابی کی اصل کیا ہے اور اس کی جڑیں کہاں تک پھیلی ہوئی ہیں اور کن اسباب سے اپنی غذا حاصل کر رہی ہیں۔ اس کے بعد ہی آپ اس پوری اسکیم کو سمجھ سکیں گے جو علاج و اصلاح کے لیے ہمارے پیش نظر ہے۔

ہماری غلامی کے اسباب

پچھلی صدی میں جو غلامی ہم پر مسلط ہوئی تھی وہ درحقیقت ہمارے صدیوں کے مسلسل مذہبی، اخلاقی، ذہنی انحطاط کا نتیجہ تھی۔ مختلف حیثیتوں سے ہم روز بروز پستی کی طرف چلے جا رہے تھے، یہاں تک کہ گرتے گرتے ہم اس مقام پر پہنچ گئے تھے جہاں اپنے بل بوتے پر کھڑا رہنا ہمارے لیے ممکن نہ تھا۔ اس حالت میں کسی نہ کسی بلا کو ہم پر مسلط ہونا ہی تھا، اور ٹھیک قانون قدرت کے مطابق وہ بلا ہم پر مسلط ہوئی۔

دینی حالت اس کی تحقیق کے لیے ہمیں سب سے پہلے اپنی اُس وقت کی دینی حالت کا جائزہ لینا چاہیے کیونکہ ہمارے لیے سب سے زیادہ اہمیت اپنے دین ہی کی ہے۔ وہی ہماری زندگی کا قوام ہے۔ اسی نے ہم کو ایک قوم اور ایک ملت بنایا ہے۔ اسی کے بل پر ہم دنیا میں کھڑے ہو سکتے ہیں اور کھڑے رہ سکتے ہیں۔

ہماری پچھلی تاریخ اس امر کی شاہد ہے کہ اس ملک میں اسلام کسی منظم کوشش کے نتیجے میں نہیں پھیلا ہے۔ سندھ کی ابتدائی اسلامی فتح اور اس کے بعد کی ایک صدی کو مستثنیٰ کیا جا سکتا ہے۔ اس کو چھوڑ کر بعد کے کسی دور میں کوئی ایسی منظم طاقت نہیں رہی جو یہاں ایک طرف اسلام کو پھیلاتی اور جہاں جہاں وہ پھیلتا جاتا وہاں اُس کو جمانے اور مضبوط و مستحکم کرنے کی کوشش بھی ساتھ ساتھ کرتی جاتی۔ بالکل ایک غیر منظم طریقے سے کہیں کوئی صاحب علم آگیا جس کے اثر سے کچھ لوگ مسلمان ہو گئے، کہیں کوئی تاجر پہنچ گیا جس کے ساتھ ربط ضبط رکھنے کی وجہ سے کچھ لوگوں نے کلمہ

پڑھ لیا، اور کہیں کوئی نیک نفس اور خدا رسیدہ بزرگ تشریف لے آئے جن کے بلند اخلاق اور پاکیزہ زندگی کو دیکھ کر بہت سے لوگ دائرۂ اسلام میں داخل ہو گئے۔ مگر نہ تو ان متفرق افراد کے پاس ایسے ذرائع تھے کہ جن جن لوگوں کو وہ مسلمان کرتے جاتے ان کی تعلیم و تربیت کا انتظام بھی ساتھ ساتھ کرتے چلے جاتے۔ اور نہ وقت کی حکومتوں ہی کو اس کی کچھ فکر تھی کہ وہ دوسرے اللہ کے بندوں کی کوششوں سے جہاں جہاں اسلام پھیل رہا تھا وہاں وہ لوگوں کی اسلامی تعلیم و تربیت کا کوئی انتظام کر دیتیں۔

اس غفلت کی وجہ سے ہمارے عوام ابتدا سے جہالت اور جاہلیت میں مبتلا رہے ہیں تعلیمی اداروں سے اگر فائدہ اٹھایا ہے تو زیادہ تر متوسط طبقوں نے اٹھایا ہے یا پھر اونچے طبقوں نے۔ عوام الناس اسلام کی تعلیمات سے بے خبر اور اس کے اصلاحی اثرات سے بڑی حد تک محروم ہی رہے۔ اسی کا نتیجہ ہم یہ دیکھ رہے ہیں کہ قبیلے کے قبیلے غیر مسلم قوموں سے نکل کر اسلام میں آئے مگر آج تک ان میں جاہلیت کی وہ بہت سی رسمیں موجود ہیں جو اسلام قبول کرنے سے پہلے ان میں پائی جاتی تھیں یہی نہیں بلکہ ان کے خیالات تک پوری طرح نہ بدل سکے۔ ان کے اندر آج بھی وہ بہت سے مشرکانہ عقائد اور مشرکانہ اوہام موجود ہیں جو اپنے غیر مسلم آباؤ اجداد کے مذہب سے انہیں وراثت میں ملے تھے۔ بڑے سے بڑا فرق جو مسلمان ہونے کے بعد ان کے اندر واقع ہوا وہ بس یہ تھا کہ انہوں نے اپنے پچھلے معبودوں کی جگہ کچھ نئے معبود خود اسلام کی تاریخ میں سے ڈھونڈ نکالے اور پرانے مشرکانہ اعمال کے نام بدل کر اسلامی اصطلاحات میں سے کچھ نئے نام اختیار کر لیے۔ عمل جوں کا توں رہا، صرف اس کا ظاہری روپ بدل گیا۔

اس کا ثبوت اگر آپ چاہیں تو کسی علاقے میں جا کر عوام کی مذہبی حالت کا جائزہ لیجیے اور پھر تاریخ میں تلاش کیجیے کہ اسلام کے آنے سے پہلے اس علاقے میں کونسا مذہب رائج تھا۔ آپ دیکھیں گے کہ آج بھی وہاں اُس سابق مذہب سے ملتے جُلتے عقائد و اعمال ایک دوسری شکل میں رائج ہیں مثلاً جہاں پہلے بودھ مذہب پایا جاتا تھا وہاں کسی زمانے میں بودھ کے آثار پوجے جاتے تھے ـــ کہیں اس کا کوئی

دانت رکھا ہوا تھا، کہیں اس کی کوئی ہڈی محفوظ تھی، کہیں اس کے دوسرے تبرکات کو مرکزِ توجہات بنا کر رکھا گیا تھا ۔۔۔ آج آپ دیکھیں گے کہ اس علاقے میں وہی معاملہ آج نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے موئے مبارک، یا آپ کے نقشِ قدم، یا دوسرے بزرگانِ دین کے آثارِ متبرکہ کے ساتھ ہو رہا ہے اسی طرح آپ پرانے پرانے مسلم قبیلوں کے موجودہ رسم و رواج کا جائزہ لیں اور پھر تحقیق کریں کہ انہی قبیلوں کی غیر مسلم شاخوں میں کیا رسمیں رائج ہیں۔ دونوں میں آپ بہت کم فرق پائیں گے۔ یہ اس بات کا کھلا ہوا ثبوت ہے کہ پچھلی صدیوں میں جو لوگ مسلمانوں کے اجتماعی معاملات کے سربراہ کار رہے ہیں انہوں نے بالعموم اپنا فرض انجام دینے میں سخت کوتاہی کی ہے۔ انہوں نے اسلام پھیلانے والے بزرگوں کے ساتھ کوئی تعاون نہیں کیا۔ کروڑوں آدمی اسلام کی کشش سے کھچ کھچ کر اس کے دائرے میں آئے، مگر جو اسلام کے گھر کے منتظم اور متولّی تھے انہوں نے ان بندگانِ خدا کی تعلیم، تربیت، ذہنی اصلاح، اور زندگی کے تزکیے کا کوئی انتظام نہ کیا۔ اس وجہ سے یہ قوم مسلمان ہو جانے کے باوجود اسلام کی برکات اور توحید کی نعمتوں سے پوری طرح بہرہ مند نہ ہو سکی، اور ان نقصانات سے نہ بچ سکی جو شرک و جاہلیت کا لازمی نتیجہ ہیں۔

پھر دیکھیے کہ ان پچھلی صدیوں میں ہمارے علماء کا کیا حال رہا ہے۔ چند مقدس بزرگوں نے تو فی الواقع اس دین کی غیر معمولی خدمات انجام دیں جن کے اثرات پہلے بھی نافع ہوئے اور آج تک نفع بخش ثابت ہو رہے ہیں، مگر عام طور پر علماء دین جن مشاغل میں مشغول رہے وہ یہ تھے کہ چھوٹے چھوٹے مسائل پر مناظرہ بازیاں کیں۔ چھوٹے مسائل کو بڑے مسائل بنایا اور بڑے مسائل کو مسلمانوں کی نظروں سے اوجھل کر دیا۔ اختلافات کو مستقل فرقوں کی بنیاد بنایا اور فرقہ بندی کو جھگڑوں اور لڑائیوں کا اکھاڑہ بنا کر رکھ دیا۔ معقولات کے پڑھنے پڑھانے میں عمریں گزار دیں اور قرآن و حدیث سے نہ خود ذوق رکھا نہ لوگوں میں پیدا کیا۔ فقہ میں اگر کوئی دلچسپی لی تو موشگافیوں اور جزئیات کی بحثوں کی حد تک لی۔ تفقّہ فی الدین پیدا کرنے کی طرف کوئی توجہ نہ کی۔ ان کے اثرات جہاں جہاں بھی پہنچے لوگوں کی نگاہیں خورد بین بن کر رہ گئیں، دوربین و جہاں دید نہ بنی

سکیں۔ آج یہ پوری میراث جھگڑوں اور مناظروں اور فرقہ بندیوں اور روز افزوں فتنوں کی لہلہاتی ہوئی فصل کے ساتھ ہمارے حصے میں آئی ہے۔

صوفیا کا حال دیکھیے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ چند پاکیزہ ہستیوں کے سوا، جنہوں نے اسلام کے حقیقی تصوف پر خود عمل کیا اور دوسروں کو اس کی تعلیم دی، باقی سب ایک ایسے تصوف کے معلم و مبلغ تھے جس میں اشراقی اور ویدانتی اور مانوی اور زرتشتی فلسفوں کی آمیزش ہو چکی تھی اور جس کے طریقوں میں جوگیوں اور راہبوں اور اشراقیوں اور رواقیوں کے طریقے اس طرح مل جل گئے تھے کہ اسلام کے خالص عقائد و اعمال سے ان کو مشکل ہی سے کوئی مناسبت رہ گئی تھی۔ خلق خدا اُن کی طرف خدا کا راستہ پانے کے لیے رجوع کرتی تھی اور وہ ان کو دوسرے رستے بتاتے تھے۔ پھر جب اگلوں کے بعد پچھلے ان کے سجادوں پر بیٹھے تو انہوں نے میراث میں دوسری املاک کے ساتھ اپنے بزرگوں کے مرید بھی پائے اور ان سے تربیت و ارشاد کے بجائے صرف نذرانوں کا تعلق باقی رکھا۔ ان حلقوں کی تمام تر کوشش پہلے بھی یہ رہی ہے اور آج بھی ہے کہ جہاں جہاں بھی ان کی پیری و پیرزادگی کا اثر پھیلا ہوا ہے وہاں دین کا صحیح علم کسی طرح نہ پہنچنے پائے، کیونکہ وہ خوب جانتے ہیں کہ عوام الناس پر ان کی خداوندی کا طلسم اسی وقت تک قائم رہ سکتا ہے جب تک وہ اپنے دین سے جاہل رہیں۔

اخلاقی حالت یہ تھی ہماری مذہبی حالت جس نے انیسویں صدی میں ہم کو غلامی کی منزل تک پہنچانے میں بہت بڑا حصہ لیا تھا اور آج اس آزادی کی صبح آغاز میں بھی یہی حالت اپنی پوری قباحتوں کے ساتھ ہماری دامن گیر ہے۔

اب اخلاقی حیثیت سے دیکھیے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ عام طور پر اُس زمانے میں ہمارا طبقہ متوسط جو ہر قوم کی ریڑھ کی ہڈی ہوتا ہے، مسلسل اخلاقی انحطاط کی بدولت بالکل بھاڑے کا ٹٹو (Mercenary) بن کر رہ گیا تھا۔ اس کا اصول یہ تھا کہ جو بھی آجائے اُجرت پر اُس کی خدمات حاصل کرلے اور پھر جس مقصد کے لیے چاہے اس سے کام لے لے۔ ہزار ہا لاکھوں

آدمی ہمارے ہاں کرائے کے سپاہی بننے کے لیے تیار تھے جنہیں ہر ایک نوکر رکھ کر جس کے خلاف چاہتا لڑوا سکتا تھا، اور ہزاروں لاکھوں ایسے لوگ بھی موجود تھے جن کے ہاتھ اور دماغ کی طاقتوں کو کم یا زیادہ اجرت پر ہر طرح اپنا نظم و نسق چلوا سکتا تھا، بلکہ اپنی سیاسی چال بازیوں تک میں استعمال کر سکتا تھا۔ ہماری اس اخلاقی کمزوری سے ہمارے ہر دشمن نے فائدہ اٹھایا ہے، خواہ وہ مرہٹے ہوں، سکھ ہوں، فرانسیسی ہوں یا ولندیزی۔ اور آخر کار انگریز نے آکر خود ہمارے ہی سپاہیوں کی تلوار سے ہم کو فتح کیا اور ہمارے ہی ہاتھوں اور دماغوں کی مدد سے ہم پر حکومت کی۔ ہماری اخلاقی حس اس درجہ کند ہو چکی تھی کہ اس روش کی قباحت سمجھنا تو درکنار، ہمیں الٹا اس پر فخر تھا۔ چنانچہ ہمارا شاعر اسے اپنے خاندانی مفاخر میں شمار کرتا ہے کہ

سو پشت سے ہے پیشۂ آبا سپہ گری

حالانکہ کسی شخص کا پیشہ ور سپاہی ہونا حقیقت میں اس کے اور اس سے تعلق رکھنے والوں کے لیے باعثِ ننگ ہے نہ کہ باعثِ عزت۔ وہ آدمی ہی کیا ہوا جو نہ حق اور باطل کی تمیز رکھتا ہو نہ اپنے اور پرائے کا امتیاز۔ جو بھی اسے پیٹ کو روٹی اور تن کو کپڑا دے دے وہ اس کے لیے شکار مارنے پر آمادہ ہو جائے اور کچھ نہ دیکھے کہ میں کس کے لیے کس پر جھپٹ رہا ہوں۔ یہ اخلاقی حالت جن لوگوں کی تھی ان میں کسی دیانت و امانت اور کسی مستقل وفاداری اور مخلصانہ وفاداری کا پایا جانا مستبعد تھا اور ہونا چاہیے تھا۔ جب وہ اپنی قوم کے دشمنوں کے ہاتھ خود اپنے آپ کو بیچ سکتے تھے، تو ان کے اندر کسی پاکیزہ اور طاقت ور ضمیر کے موجود ہونے کی آخر وجہ ہی کیا ہو سکتی تھی؟ کیوں وہ رشوت اور غبن کا نام "دستِ غیب" اور "خدا کا فضل" نہ رکھتے؟ کیوں وہ ابن الوقت اور چڑھتے سورج کے پرستار نہ ہوتے؟ اور کیوں ان میں یہ وصف پیدا نہ ہوتا کہ جس کے ہاتھ سے انہیں تنخواہ ملتی ہو اس کے لیے اپنے ایمان و ضمیر کے خلاف سب کچھ کرنے پر آمادہ ہو جائیں؟ —— اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ ہمارے ملازمت پیشہ طبقے کی اکثریت آج جن اوصاف کا اظہار کر رہی ہے وہ کوئی اتفاقی کمزوری نہیں ہے جو

اچانک ان میں پیدا ہو گئی ہو بلکہ اس کی جڑیں ہماری روایات میں گہری جمی ہوئی ہیں۔ البتہ افسوس اگر ہے تو اس بات کا ہے کہ کل ان سے ہمارے دشمن ناجائز فائدہ اٹھا رہے تھے، اور آج ان کو ہماری قوم کے وہ رہنما استعمال کر رہے ہیں جنہیں درحقیقت قوم کے امراض کا معالج ہونا چاہیے تھا نہ کہ ان امراض سے فائدہ اٹھانے والا!

ہمارے طبقۂ متوسط کی ان کمزوریوں میں ہمارے علماء بھی شریک تھے۔ اگرچہ ایک قلیل تعداد جس طرح طبقۂ متوسط میں بلند اخلاق اور مضبوط سیرت لوگوں کی موجود تھی، اسی طرح علماء میں بھی کچھ ایسی مقدس شخصیتیں موجود رہیں جنہوں نے اپنے فرض کو ٹھیک ٹھیک پہچانا اور اپنی جانیں لڑا کر اسے ادا کیا اور دنیا کی کوئی دولت ان کو نہ خرید سکی۔ مگر عام طور پر جو اخلاقی حالت طبقۂ متوسط کی تھی وہی علماء کی بھی تھی۔ ان میں بیشتر وظیفہ خوار تھے کسی نہ کسی بادشاہ یا امیر یا درباری سے وابستہ ہو جانا، اس کے وظیفے کھانا، اس کے منشا کے مطابق دین اور دینی قوانین کی تعبیریں کرنا، اپنے ذاتی مفاد کو دین کے تقاضوں پر مقدم رکھنا، اور اپنے مخدوموں کی خاطر علماء حق کو دبانے کے لیے مذہب کے ہتھیار استعمال کرنا ان کا شعار رہا۔ یہ مچھر کو چھانتے اور اونٹ نگلتے رہے ہیں۔ بے اثر اور بے دولت لوگوں کے معاملہ میں تو ان کی یہ حس اتنی تیز رہی ہے کہ مستحبات اور مکروہات اور چھوٹے سے چھوٹے جزئیات تک میں یہ ان کو معاف کرنے پر کبھی تیار نہ ہوئے اور ان امور کی خاطر انہوں نے بڑے بڑے جھگڑے برپا کر دیے مگر اہل دولت اور ارباب اقتدار کے معاملہ میں، خواہ وہ مسلم ہوں یا کافر، یہ ہمہ تن مصالحت بنے رہے اور جزئیات چھوڑ کر کلیات تک میں انہوں نے ان کے لیے رخصتیں نکالیں۔

رہے ہمارے امراء، تو ان کے لیے دنیا میں صرف دو ہی چیزیں دلچسپی کا مرکز رہ گئی تھیں۔ ایک پیٹ۔ دوسرے شرمگاہ۔ ان کے سوا کسی دوسری چیز کی ان کی نگاہ میں کوئی اہمیت نہ رہی تھی۔ ساری کوششیں اور ساری محنتیں بس انہی کی خدمت کے لیے وقف تھیں، اور قوم کی دولت سے انہی پیشوں اور صنعتوں اور حرفتوں کو پروان چڑھایا جا رہا تھا جو ان دو چیزوں کی خدمت کریں

اس سے ہٹ کر اگر کسی امیر نے اپنی دولت و طاقت کو کسی بڑے مقصد کے لیے استعمال کیا تو سارے امیروں نے مل کر اسے گرانے کی کوشش کی اور اپنی قوم کے دشمنوں سے اس کے خلاف ساز باز کرنے میں بھی تامل نہ کیا۔

ذہنی حالت اس کے بعد جب ذہنی حیثیت سے ہم اپنی تاریخ کا جائزہ لیتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ کئی صدیوں سے ہمارے ہاں علمی تحقیقات کا کام قریب قریب بند تھا۔ ہمارا سارا پڑھنا پڑھانا بس علومِ اوائل تک محدود تھا۔ ہمارے نظامِ تعلیم میں یہ تصور گہری جڑوں کے ساتھ جم گیا تھا کہ اسلاف جو کام کر گئے ہیں وہ علم و تحقیق کا حرفِ آخر ہے، اس پر کوئی اضافہ نہیں کیا جا سکتا۔ بڑی سے بڑی علمی خدمت بس یہی ہو سکتی تھی کہ اگلوں کی لکھی ہوئی کتابوں پر شرحوں اور حاشیوں کے ردّے پڑھائے جائیں۔ انہی چیزوں کے لکھنے میں ہمارے مصنفین، اور ان کے پڑھنے پڑھانے میں ہمارے مدرسین مشغول رہے۔ کسی نئی فکر، کسی نئی تحقیقات، کسی نئی دریافت کا مشکل ہی سے قریب کی اِن صدیوں میں ہمارے ہاں کہیں پتہ چلتا ہے۔ اس کی وجہ سے ایک مکمل جمود کی سی کیفیت ہماری ذہنی فضا پر طاری ہو چکی تھی۔

ظاہر ہے کہ جو قوم اس حالت میں مبتلا ہو چکی ہو وہ زیادہ دیر تک آزاد نہیں رہ سکتی تھی۔ اس کو لامحالہ کسی نہ کسی ایسی قوم سے مغلوب ہو ہی جانا تھا جو حرکت کرنے والی اور آگے بڑھنے والی ہو، جس نے اپنے عام لوگوں میں بیداری پیدا کر لی ہو، جس کے افراد میں اپنے فرائض کا ـــــ جو کچھ بھی وہ اپنے فرائض سمجھتے ہوں ـــــ احساس پایا جاتا ہو، جس کے کارکنوں اور کارفرماؤں میں کوئی مستقل اور مخلصانہ وفاداری موجود ہو، جس کے اہلِ علم تحقیقات کرنے والے اور نئی نئی طاقتیں دریافت کرنے والے ہوں، جس کے اہلِ تدبیر ان نئی دریافت شدہ طاقتوں کو زندگی کے کاموں میں استعمال کرنے والے ہوں، اور جس کا قدم تمدن و تہذیب کے مختلف شعبوں میں ترقی کی طرف مسلسل بڑھا چلا جا رہا ہو۔ ایسی کسی قوم کی موجودگی میں ایک جامد اور ایک ضعیف الاخلاق اور ایک جاہلیت زدہ قوم آخر کتنی دیر زمین پر قابض رہ سکتی تھی؟ پس یہ کوئی اتفاقی

حادثہ نہ تھا بلکہ قانونِ فطرت کا تقاضا تھا کہ ہم مغرب کی ترقی یافتہ قوموں میں سے ایک کے غلام ہو کر رہے۔

مغربی تہذیب کی بنیادیں

اب ہمیں دیکھنا چاہیے کہ وہ قوم جو مغرب سے آکر ہم پر مسلط ہوئی، جس کی طاقت سے ہم مغلوب ہوئے، اور جس کی غلامی کا جوا ہماری گردن پر رکھا گیا، وہ اپنے ساتھ کیا کچھ لائی تھی۔ اس کے نظریات کیا تھے؟ اس کا مذہب اور اس کا فلسفہ کیا تھا؟ اس کے اخلاقی اصول کیا تھے؟ اس کے تمدنی و تہذیبی رنگ ڈھنگ کیا تھے؟ اس کی سیاست کن بنیادوں پر مبنی تھی؟ اور اس کی ان سب چیزوں نے ہمیں کس کس طرح کتنا کتنا متاثر کیا؟

مذہب جن صدیوں میں ہم مسلسل انحطاط کی طرف جا رہے تھے، ٹھیک وہی صدیاں تھیں جن میں یورپ نشاۃ جدیدہ کی ایک نئی تحریک کے سہارے اُبھر رہا تھا۔ اس تحریک کا آغاز ہی میں دورِ متوسط کے عیسائی مذہب سے تصادم ہو گیا اور یہ تصادم ایک ایسے افسوسناک نتیجے پر ختم ہوا جو نہ صرف یورپ کے لیے بلکہ ساری دنیا کے لیے غارت گر ثابت ہوا۔ پرانے زمانے کے عیسائی متکلمین نے اپنے مذہبی عقائد کی اور بائبل کے تصورِ کائنات و انسان کی پوری عمارت یونانی فلسفہ و سائنس کے نظریات، دلائل اور معلومات پر تعمیر کر رکھی تھی اور اُن کا گمان یہ تھا کہ ان بنیادوں میں سے کسی کو اگر ذرا سی ٹھیس بھی لگ گئی تو یہ پوری عمارت دھڑام سے زمین پر آ رہے گی اور اس کے ساتھ مذہب بھی ختم ہو جائے گا۔ اس لیے وہ نہ کسی ایسی تنقید و تحقیق کو گوارا کرنے کے لیے تیار تھے جو یونانی فلسفہ و سائنس کے مسلمات کو مشتبہ بناتی ہو، نہ کسی ایسے فلسفیانہ تفکر کو برداشت کر سکتے تھے جو ان مسلمات سے ہٹ کر کوئی دوسری ایسی فکر پیش کرتی ہو جس کی وجہ سے اہلِ کلیسا کو اپنے علمِ کلام پر نظرِ ثانی کرنی پڑ جائے، اور نہ کسی ایسی علمی تحقیقات کی اجازت دے سکتے تھے جس سے کائنات و انسان کے بارے میں بائبل کی دی ہوئی اور متکلمین کی مانی ہوئی تصویر کا کوئی جز غلط ثابت ہو جائے۔ اس طرح کی ہر چیز کو وہ مذہب کے لیے، اور مذہب پر بنے ہوئے پورے نظامِ تمدن و سیاست و معیشت کے لیے

براہِ راست خطرہ سمجھتے تھے۔ اس کے برعکس جو لوگ نشاۃِ جدیدہ کی تحریک اور اس کے محرکات کے زیرِ اثر تنقید، تحقیق اور دریافت کا کام کر رہے تھے انہیں قدم قدم پر اس فلسفہ و سائنس کی کمزوریاں معلوم ہو رہی تھیں جن کے سہارے عقائد و کلام کا یہ پورا نظام کھڑا ہوا تھا۔ مگر وہ جوں جوں اس میدان میں آگے بڑھتے تھے، اہلِ کلیسا اپنے مذہبی اور سیاسی اقتدار کے بل بوتے پر روز بروز زیادہ سختی کے ساتھ ان کی راہ روکنے کی کوشش کرتے تھے۔ آنکھوں کو پچھلے زمانے کی مانی ہوئی حقیقتوں کے خلاف بہت سی چیزیں روزِ روشن میں نظر آ رہی تھیں۔ مگر اہلِ کلیسا کو اصرار تھا کہ ان مسلّمات پر نظرِ ثانی کرنے کے بجائے دیکھنے والی آنکھیں پھوڑ دی جائیں۔ دماغوں کو بہت سے ان نظریات میں جھول محسوس ہو رہا تھا جن کو پہلے بعض عقائد کی اٹل دلیل سمجھا گیا تھا۔ مگر اہلِ کلیسا کہتے تھے کہ ان دلائل پر غورِ مکرر کرنے کے بجائے ان دماغوں کو پاش پاش کر دینا چاہیے جو ایسی باتیں سوچتے ہیں۔

اس کشمکش کا پہلا نتیجہ یہ ہوا کہ جدید علمی بیداری میں اوّل روز ہی سے مذہب اور اہلِ مذہب کے خلاف ایک ضد سی پیدا ہو گئی اور جوں جوں اہلِ مذہب کی سختیاں بڑھتی گئیں، یہ ضد بھی بڑھتی اور پھیلتی چلی گئی۔ یہ ضد صرف مسیحیت اور اس کے کلیسا ہی تک محدود نہ رہی بلکہ مذہب فی نفسہٖ اس کا ہدف بن گیا۔ علومِ جدیدہ اور تہذیبِ جدید کے علمبرداروں نے یہ سمجھ لیا کہ مذہب بجائے خود ایک ڈھونگ ہے۔ وہ کسی عقلی امتحان کی ضرب نہیں سہہ سکتا۔ اس کے عقائد دلیل پر نہیں بلکہ اندھے اذعان پر مبنی ہیں۔ علم کی روشنی بڑھنے سے وہ ڈرتا ہے کہ کہیں اس کا پول کھل جائے۔

پھر جب علم کے میدان سے آگے بڑھ کر سیاست اور معیشت اور نظامِ اجتماعی کے مختلف میدانوں میں یہ کشمکش چلی اور اہلِ کلیسا کی حتمی شکست کے بعد تہذیبِ جدید کے علمبرداروں کی قیادت میں ایک نئے نظامِ زندگی کی عمارت اٹھی، تو اس سے دو اور نتیجے برآمد ہوئے جنہوں نے نئے دور کی پوری انسانی تاریخ پر گہرا اثر ڈالا:

ایک یہ کہ نئے نظامِ زندگی کے ہر شعبے سے "مذہب" کو عملاً بے دخل کر دیا گیا، اور اس کا

دائرہ صرف شخصی عقیدہ و عمل تک محدود کر کے رکھ دیا گیا۔ یہ بات تہذیبِ جدید کے بنیادی اصولوں میں داخل ہو گئی کہ مذہب کو سیاست، معیشت، اخلاق، قانون، علم و فن، غرض اجتماعی زندگی کے کسی شعبے میں بھی دخل دینے کا حق نہیں ہے۔ وہ محض افراد کا ایک شخصی معاملہ ہے۔ کوئی شخص اپنی انفرادی زندگی میں خدا اور پیغمبروں کو ماننا چاہے تو مانے، اور ان کی دی ہوئی ہدایات کی پیروی کرنا چاہے تو کرتا رہے۔ مگر اجتماعی زندگی کی ساری اسکیم اس سوال سے قطع نظر کر کے بننی اور چلنی چاہیے کہ مذہب اس کے بارے میں کیا ہدایت دیتا ہے اور کیا ہدایت نہیں دیتا۔

دوسرے یہ کہ تہذیبِ جدید کی رگ رگ میں خدا بیزاری اور لامذہبیت کی ذہنیت پیوست ہو گئی۔ علوم و فنون اور ادب کا جو کچھ بھی ارتقاء ہوا اس کی جڑیں وہ ضد برابر موجود رہی جو علمی بیداری کے آغاز میں مذہب اور اس سے تعلق رکھنے والی ہر چیز کے خلاف پیدا ہو چکی تھی۔ اس فکری غذا سے پرورش پائی ہوئی تہذیب جہاں جہاں بھی پہنچی وہاں اندازِ فکر یہ ہو گیا کہ مذہب جو چیز بھی پیش کرتا ہے، خواہ وہ خدا اور آخرت اور وحی اور رسالت کا عقیدہ ہو یا کوئی اخلاقی وتمدنی اصول، بہر حال وہ شک کا مستحق ہے، اُس کی صحت کا کوئی ثبوت ملنا چاہیے، اور نہ ملے تو اس سے انکار کیا جانا چاہیے۔ اس کے برعکس ہر وہ چیز جو دنیوی علوم و فنون کے اساتذہ کی طرف سے آئے وہ مان لینے کی مستحق ہے، الّا یہ کہ اس کے غلط ہونے کا کوئی ثبوت مل جائے۔ یہ اندازِ خیال مغرب کے پورے نظامِ فکر پر اثر انداز ہوا ہے اور اس نے صرف علم و ادب ہی کو مذہبی نقطۂ نظر سے منحرف نہیں کر دیا ہے بلکہ تمام وہ اجتماعی فلسفے اور اجتماعی نظام، جو اس نظامِ فکر کی بنیاد پر بنے ہیں، عملاً خدا پرستی کے تخیل سے خالی اور آخرت کے تصور سے عاری ہیں۔

فلسفۂ حیات یہ تو تھا مذہب کے بارے میں اس آنے والی فاتح تہذیب کا رویّہ۔ اب دیکھیے کہ اس کا اپنا فلسفۂ حیات کیا تھا جسے مذہب کی نفی کر کے اس نے اختیار کیا تھا۔

یہ سراسر ایک مادہ پرستانہ فلسفہ تھا۔ مغرب کے فکری رہنما محسوسات سے ماوراء کسی غیبی حقیقت کو ماننے کے لیے نہ تو تیار ہی تھے اور نہ وحی و الہام کے سوا — جس کے وہ منکر تھے — حقائقِ غیب

کو جاننے اور ٹھیک سمجھنے کا اور کوئی ذریعہ ہی ہو سکتا تھا۔ پھر سائنٹفک اسپرٹ اس امر میں بھی مانع تھی کہ وہ مجرد قیاسات پر غیبی حقیقتوں کے متعلق کسی تصور کی عمارت کھڑی کر دیں۔ اس کی کوشش اگر کی بھی گئی تو علمی تنقید کے مقابلے میں وہ نہ ٹھہر سکی۔ اس لیے غیب کے بارے میں جب وہ شک اور لا ادریت کے مقام سے آگے نہ بڑھ سکے تو ان کے لیے اس کے سوا چارہ نہ رہا کہ دنیا اور اس کی زندگی کے متعلق وہ جو رائے بھی قائم کریں صرف حواس کے اعتماد پر کریں۔ اس چیز نے ان کے پورے فلسفۂ زندگی کو ظاہر پرستنہ بنا کر رکھ دیا۔ انہوں نے سمجھا کہ انسان ایک قسم کا حیوان ہے جو اس زمین پر پایا جاتا ہے۔ وہ کسی کا تابع ہے نہ کسی کے آگے جواب دہ۔ اس کو کہیں اوپر سے ہدایت بھی نہیں ملتی۔ اپنی ہدایت اسے خود لینی ہے اور اس ہدایت کا ماخذ اگر کوئی ہے تو قوانینِ طبیعی ہیں، یا حیوانی زندگی کی معلومات، یا پھر خود پچھلی انسانی تاریخ کے تجربات۔ انہوں نے سمجھا کہ زندگی جو کچھ ہے بس یہی دنیا کی زندگی ہے۔ اسی کی کامیابی اور خوشحالی عین مطلوب ہے۔ اور اسی کے اچھے اور بُرے نتائج مدارِ فیصلہ ہیں۔ انہوں نے سمجھا کہ انسان کی زندگی کا کوئی مقصد اپنی طبیعت کے تقاضوں کو پورا کرنے اور اپنے نفس کی خواہشوں کو حاصل کرنے کے سوا نہیں ہے۔ انہوں نے سمجھا کہ حقیقت جو کچھ بھی ہے انہی چیزوں کی ہے جن کو ناپا یا تولا جا سکے، یا جن کا وزن و قدر کسی طرح کی پیمائش قبول کر سکے۔ جو چیزیں اس نوعیت کی نہیں ہیں وہ بے حقیقت اور بے قدر ہیں، ان کے پیچھے پڑنا وقت ضائع کرنا ہے۔

میں یہاں اُن فلسفیانہ نظاموں کا ذکر نہیں کر رہا ہوں جو مغرب میں بنے، کتابوں میں لکھے گئے، اور یونیورسٹیوں میں پڑھے پڑھائے جاتے رہے بلکہ اُس تصورِ کائنات و انسان اور اُس تصورِ حیاتِ دنیا کا ذکر کر رہا ہوں جسے مغربی تہذیب و تمدن نے اپنے اندر جذب کیا اور جو ایک عام مغربی ذہن میں، اور اس سے اثر لینے والے ایک عام انسان کے ذہن میں پیوست ہوا۔ اس کا خلاصہ یہی کچھ ہے جو میں نے آپ کے سامنے بیان کیا ہے۔

اس کے علاوہ تین بڑے فلسفیانہ نظریے ایسے ہیں جو اٹھارویں اور انیسویں صدی میں ——

اسی زمانے میں جبکہ ہم مغرب کے غلام ہو رہے تھے ---- اٹھے اور اپنی تفصیلات سے قطع نظر، اپنی روح کے اعتبار سے پوری تہذیب پر چھا گئے۔ میں یہاں خاص طور پر ان کا ذکر کروں گا، کیونکہ انسانی زندگی پر جتنا ہمہ گیر اثر ان کا پڑا ہے، شاید کسی اور چیز کا نہیں پڑا۔

ہیگل کا فلسفۂ تاریخ | ان میں سے پہلا نظریہ وہ ہے جو ہیگل نے تاریخ انسانی کی تعبیر کے سلسلے میں پیش کیا ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ تاریخ کے ایک دور میں انسانی تہذیب وتمدن کا جو نظام بھی ہوتا ہے وہ اپنے تمام شعبوں اور اپنی تمام شکلوں سمیت دراصل چند مخصوص تخیلات پر مبنی ہوتا ہے جو اسے ایک دورِ تہذیب بناتے ہیں۔ یہ دورِ تہذیب جب پختہ ہو چکتا ہے تو اس کی کمزوریاں واضح ہونی شروع ہوتی ہیں اور اس کے مقابلے میں کچھ دوسرے تخیلات ابھرنے شروع ہوتے ہیں جو اس سے جنگ شروع کر دیتے ہیں۔ اس نزاع وکشمکش سے ایک نیا دورِ تہذیب جنم پاتا ہے جس میں پچھلے دورِ تہذیب کے باقیاتِ صالحات بھی رہ جاتے ہیں اور کچھ نئی خوبیاں بھی اُن تخیلات کے اثر سے پیدا ہو جاتی ہیں جن کی یلغار سے مجبور ہو کر پچھلے دور کے غالب تخیلات بالآخر مصالحت پر مجبور ہوئے تھے۔ پھر یہ دورِ تہذیب بھی پختگی کو پہنچ کر اپنے ہی بطن سے اپنے چند مخالف تخیلات کو جنم دیتا ہے، اور پھر نزاع وکشمکش برپا ہوتی ہے اور پھر دونوں کی مصالحت سے ایک تیسرا دور وجود میں آتا ہے جو پچھلے دور کی خوبیاں اپنے اندر باقی رکھتا ہے اور ان کے ساتھ نئے تخیلات کی لائی ہوئی خوبیاں بھی جذب کر لیتا ہے۔

اس طرح ہیگل نے انسانی تہذیب کے ارتقاء کی جو تشریح کی اس سے عام طور پر ذہنوں نے یہ اثر قبول کیا کہ پچھلا ہر دورِ تہذیب اپنے اپنے وقت پر اپنی خامیوں اور کمزوریوں کی وجہ سے ختم ہوا ہے، اور اپنی خوبیاں ہر بعد کے دورِ تہذیب میں چھوڑ گیا ہے۔ بالفاظ دیگر اب جس دورِ تہذیب سے ہم گزر رہے ہیں وہ گویا خلاصہ ہے اُن تمام اجزائے صالحہ کا جو پہلے گزرے ہوئے ادوارِ تہذیب میں پلتے جاتے تھے۔ آگے اگر کسی ترقی کا امکان ہے تو اُن نئے تخیلات میں ہے جو اس دورِ تہذیب کے بنیادی تخیلات سے جنگ کرنے کے لیے اٹھیں پچھلے ادوار میں

کوئی چیز ایسی موجود نہیں ہے جس سے ہدایت و رہنمائی حاصل کرنے کے لیے اب پیچھے پلٹ کر دیکھنے کی ضرورت ہو۔ کیونکہ ان کے جو اجزاء بعد کے ادوارِ تہذیب میں جذب نہیں ہوئے اُن کو آزما کر اور ناقص پا کر انسانی تاریخ پہلے ہی ٹھکرا چکی ہے۔ ہمارا تاریخی ذوق ان کی کسی چیز کی اگر کوئی قدر کر سکتا ہے تو اس حیثیت سے کر سکتا ہے کہ وہ اپنے وقت میں ایک قابل قدر چیز رہ چکی ہے اور انسانی تہذیب کے ارتقاء میں اپنے حصے کا کام انجام دے چکی ہے۔ مگر وہ آج اس دور کے لیے نہ قابل قدر ہے نہ کسی طرح مطمح نظر بننے کی مستحق۔ اس لیے کہ تاریخ اس کے بارے میں پہلے ہی اپنا فیصلہ دے چکی۔

آپ ذرا غور کریں کہ درحقیقت یہ کیسا خطرناک فلسفہ ہے۔ تہذیب انسانی کی تاریخ کا یہ تصور جس شخص کے ذہن میں اتر جائے، کیا آپ توقع کر سکتے ہیں کہ اس کے دل میں پھر ان ادوارِ تہذیب کی کچھ بھی قدر و قیمت باقی رہ سکتی ہے جن میں ابراہیم اور موسیٰ اور محمد صلی اللہ علیہم اجمعین گزرے ہیں؟ کیا وہ کبھی دورِ نبوت اور خلافت راشدہ کی طرف بھی ہدایت و رہنمائی کے لیے رجوع کر سکتا ہے؟ دراصل یہ ایک ایسا مدلل اور منظم فکری حملہ ہے جس کی ضرب اگر کسی ذہن پر کاری لگ جائے تو اس میں سے دینی تخیل کی جڑ ہی کٹ کر رہ جاتی ہے[1]۔

ڈاروِن کا نظریۂ ارتقاء | دوسرا فلسفہ جو انیسویں صدی میں اُبھرا اور انسانی ذہن پر چھایا وہ ڈاروِن کے نظریۂ ارتقاء کا پیدا کردہ تھا۔ مجھے یہاں اُس کے حیاتیاتی (Biological) پہلو سے بحث نہیں ہے۔ میں اُس کے صرف اُن فلسفیانہ اثرات سے بحث کر رہا ہوں جو ڈاروِن کے طرزِ استدلال اور اُس کے اخذ کردہ نتائج سے نکل کر وسیع تر اجتماعی فکر میں جذب ہوئے۔ عام انسانی ذہن نے ڈاروِن کے بیان سے متاثر ہو کر کائنات کا جو تصور قائم کیا وہ یہ تھا کہ یہ کائنات ایک رزم گاہ ہے جہاں ہر آن ہر طرف زندگی و بقا کے لیے ایک ابدی جنگ بپا ہے۔ انتظامِ قدرت

[1] یہاں اس فلسفۂ تاریخ پر تنقید کرنے کا کوئی موقع نہیں ہے۔ اس کی غلطیاں اگر کوئی صاحب سمجھنا چاہیں تو وہ ہماری کتاب تنقیحات حصہ دوم (صفحہ ۲۲۵-۲۲۴) اور تفہیم القرآن (سورۂ مائدہ، حاشیہ ۴۳) ملاحظہ فرمائیں۔

ہے ہی کچھ ایسا کہ جسے زندہ اور باقی رہنا ہو اُسے نزاع اور کشمکش اور مزاحمت کرنی پڑتی ہے، اور مزاج فطرت واقع ہی کچھ اس طرح ہُوا ہے کہ اس کی نگاہ میں وہی بقا کا مستحق ہے جو قوتِ بقا کا ثبوت دے دے۔ اس بے رحم نظام میں جو فنا ہوتا ہے وہ اس لیے فنا ہوتا ہے کہ وہ کمزور ہے، اور اسے فنا ہونا ہی چاہیے۔ اور جو باقی رہتا ہے وہ اس لیے باقی رہتا ہے کہ وہ طاقت ور ہے اور اسے باقی ہی رہنا چاہیے۔ زمین اور اس کا ماحول اور اس کے وسائلِ زندگی غرض یہاں جو کچھ بھی ہے طاقت ور کا حق ہے جس نے زندہ رہنے کی قابلیت کا ثبوت دے دیا ہو۔ کمزور کا ان چیزوں پر کوئی حق نہیں ہے اسے طاقت ور کے لیے جگہ خالی کرنی چاہیے اور طاقت ور سراسر برسرِحق ہے اگر وہ اسے مٹا کر یا مٹا کر اس کی جگہ لیتا ہے۔

غور کیجیے، یہ تصورِ کائنات جب دماغوں میں بیٹھ جائے اور نظامِ فطرت کو اس نگاہ سے دیکھا جانے لگے تو انسان انسان کے لیے کیا کچھ بن کر رہے گا؟ اس فلسفۂ زندگی میں ہمدردی، محبت، رحم، ایثار اور اس طرح کے دوسرے شریفانہ انسانی جذبات کے لیے کیا جگہ ہو سکتی ہے؟ اس میں عدل و انصاف، امانت و دیانت، اور صداقت و راستبازی کا کیا کام؟ اس میں حق کا وہ مفہوم کہاں باقی رہتا ہے جو کبھی کمزور کو بھی پہنچ سکتا ہو، اور ظلم کے وہ معنی کب ہو سکتے ہیں جن سے کبھی طاقت ور بھی گناہ گار ٹھیرایا جا سکتا ہو؟ لڑنے جھگڑنے کا کام اگرچہ پہلے بھی انسان کرتا رہا ہے، مگر پہلے اسے فساد سمجھا جاتا تھا اور اب وہ عین تقاضائے فطرت ہے۔ کیونکہ کائنات تو ہے ہی ایک میدانِ جنگ۔ ظلم پہلے بھی دنیا میں ہوتا تھا، مگر پہلے وہ ظلم تھا اور اب اسے ایک ایسی منطق مل گئی جس سے وہ طاقت ور کا حق بن گیا۔ اس فلسفے کے بعد یورپ والوں کو اُن تمام مظالم کے لیے جو انہوں نے دوسری قوموں پر ڈھائے، ایک محکم دلیل ہاتھ آگئی۔ انہوں نے اگر امریکہ اور آسٹریلیا اور افریقہ کی پرانی نسلوں کو مٹایا اور کمزور قوموں کو اپنا غلام بنایا تو یہ گویا ان کا حق تھا جو انہوں نے عین قانونِ فطرت کے مطابق حاصل کیا۔ مٹنے والے مٹنے ہی کے مستحق تھے اور ان کی جگہ لینے والوں کا حق یہی تھا کہ وہ ان کی جگہ لیں۔ اس

بارے میں اگر اہلِ مغرب کے ضمیر میں پہلے کوئی خلش تھی بھی تو ڈارون کی منطق نے اسے دلائل و شواہد سے دور کر دیا۔ سائنس میں اس نظریے کی حیثیت علمی کچھ بھی ہو[1]، معاشرت اور تمدن اور سیاست میں آکر تو اس نے انسان کو انسان کے لیے بھیڑیا بنا کر رکھ دیا۔

مارکس کی مادی تعبیرِ تاریخ

اسی کا ہم جنس ایک اور فلسفہ تھا جو ڈارون ہی کے زمانے میں مارکس کی مادی تعبیرِ تاریخ کے بطن سے نکلا۔ اس کی تفصیلات اور اس کے دلائل سے میں یہاں کوئی بحث نہ کروں گا اور نہ اس کی علمی حیثیت پر کوئی تنقید ہی کروں گا[2]۔ میں یہاں صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ انسانی ذہن کو اس نے بھی حیاتِ دنیا کا وہی تصور دیا جو پہلے ہیگل نے اور پھر ڈارون نے دیا تھا۔ ہیگل نے فکر کی دنیا کو رزم گاہ بنا کر پیش کیا تھا۔ ڈارون نے کائنات اور نظامِ فطرت کو میدانِ جنگ بنا کر دکھایا۔ اور مارکس نے وہی تصویر خود انسانی معاشرے کی بنا کر دکھا دی۔ اس تصویر میں انسان ہم کو شروع سے لڑتا جھگڑتا نظر آتا ہے۔ اس کی فطرت کا تقاضا یہی ہے کہ اپنی اغراض اور اپنے مفاد کے لیے اپنے ہم جنسوں سے لڑے۔ وہ سراسر خود غرضی کی بنا پر مختلف طبقوں میں تقسیم ہوا ہے۔ سراسر خود غرضی کی بنا پر ان طبقوں میں کشمکش اور نزاع برپا رہی ہے۔ اور انسانی تاریخ کا سارا ارتقاء اسی خود غرضانہ طبقاتی کشمکش کی بدولت ہوا ہے۔ قوموں اور قوموں کی لڑائی تو درکنار، خود ایک ہی قوم کے مختلف طبقوں کی لڑائی بھی اس تصویر میں ہم کو سراسر ایک تقاضائے فطرت نظر آتی ہے۔ اس میں ہم دیکھتے ہیں کہ انسان اور انسان کے درمیان اگر کوئی رشتہ ہے تو وہ صرف اغراض و مفاد کے اشتراک کا رشتہ ہے۔ ان رشتہ داروں سے ملنا اور متفق ہو کر اُن سب لوگوں سے لڑنا جن سے آدمی کی معاشی اغراض متصادم ہوں ــــ خواہ وہ اپنے ہی ہم قوم اور ہم مذہب کیوں نہ ہوں ــــ سراسر حق ہے، اور اس حرکت کا ارتکاب نہیں بلکہ اس سے اجتناب خلافِ فطرت ہے۔

---

[1] اس کی علمی حیثیت پر مختصر تنقید ہماری کتاب تفہیمات حصہ دوم میں ملے گی۔

[2] اس فلسفے پر بھی ایک مختصر تنقید تفہیمات حصہ دوم میں کی گئی ہے

اخلاق یہ تھے وہ فلسفے اور وہ عقائد و افکار جو فاتح تہذیب کے ساتھ آئے اور ہم پر مسلط ہوئے۔ اب دیکھیے کہ اخلاق کے معاملے میں ان آنے والوں کے ساتھ کس قسم کے نظریات اور عملیات یہاں در آئے۔ خدا اور آخرت کو نظر انداز کر دینے کے بعد ظاہر ہے کہ اخلاق کے لیے مادی قدروں کے سوا کوئی قدر، اور تجربی بنیادوں کے سوا کوئی بنیاد باقی نہیں رہتی۔ اس معاملے میں اگر کوئی شخص چاہے کہ وہ قدریں جو مذہب نے دی تھیں، مذہب کے سوا کسی دوسری بنیاد پر قائم رہیں۔ اور وہ اخلاقی اصول جو انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات سے انسان نے سیکھے تھے، ایمان کے سوا کسی اور چیز کے سہارے انسانی زندگی میں چلتے رہیں، تو یہ کسی طرح ممکن نہیں ہے۔ اسی لیے اہلِ مغرب میں سے جن لوگوں نے اس کی کوشش کی وہ ناکام ہوئے۔ بے دینی اور انکارِ آخرت کی فضا میں فی الواقع جس فلسفۂ اخلاق کو فروغ نصیب ہوا اور عملاً اہلِ مغرب کی زندگی میں جس نے رواج پایا وہ تھا خالص افادیت (Utilitarianism) کا فلسفہ جس کے ساتھ لذتیت (Epicureanism) کے ایک سادہ سے مادہ پرستانہ خلاصے کی آمیزش ہو گئی تھی۔ اسی پر مغرب کے پورے تمدن اور مغربی زندگی کے پورے طرزِ عمل کی بنا رکھی گئی۔ کتابوں میں افادیت اور لذتیت کی جو تشریحات لکھی گئی ہیں وہ چاہے جو کچھ بھی ہوں، مگر مغربی تہذیب اور سیرت و کردار میں اس کا جو جوہر جذب ہوا وہ یہ تھا کہ قابلِ قدر اگر کوئی چیز ہے تو صرف وہ جس کا کوئی فائدہ میری ذات کو پہنچتا ہو، یا "میری ذات" کے تصور میں کچھ وسعت پیدا ہو جائے تو، میری قوم کو پہنچتا ہو۔ اور فائدے سے مراد ہے دنیوی فائدہ — کوئی راحت، کوئی لذت، یا کوئی مادی منفعت۔ جس چیز سے اس طرح کا کوئی فائدہ میری طرف آئے یا میری قوم کی طرف آئے وہ نیکی ہے۔ قابلِ قدر ہے، مطلوب و مقصود ہے اور وہی اس لائق ہے کہ اس کے پیچھے ساری کوششیں صرف کی جائیں۔ اور جو ایسی نہیں ہے جس کا کوئی محسوس یا قابلِ پیمائش فائدہ اس دنیا میں مجھے یا میری قوم کو حاصل نہیں ہوتا وہ کسی توجہ کے لائق نہیں ہے۔ اور اس کے برعکس جو چیز دنیوی حیثیت سے نقصان دہ ہے، یا دنیوی فائدوں اور لذتوں سے محروم کرنے والی ہے، وہی بدی اور وہی گناہ ہے۔ اس سے اجتناب لازم ہے۔

اس اخلاق میں خیر و شر کا کوئی مستقل معیار نہیں ہے۔ کردار کے حسن و قبح کے لیے کوئی مستقل اصول نہیں ہے۔ ہر چیز اضافی اور عارضی ہے۔ ذاتی یا قومی منفعت کے لیے ہر اصول بنایا اور توڑا جا سکتا ہے۔ حصولِ مقصد کے لیے بدتر سے بدتر ذریعہ اختیار کیا جا سکتا ہے۔ فائدوں اور لذتوں کو ہر طریقے سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ آج جو کچھ خیر ہے وہ کل شر ہو سکتا ہے، اور آج جو خیر ہے وہ کل شر قرار پا سکتا ہے۔ ایک کے لیے حق و باطل کا معیار اور ہے اور دوسرے کے لیے اور۔ حلال اور حرام کی کوئی مستقل تمیز جس کا ہر حال میں لحاظ کیا جائے اور حق و باطل کا کوئی ابدی فرق جو کسی حال میں نہ بدلے، ایک دقیانوسی تصور ہے جسے ترقی کے قدم بہت پیچھے چھوڑ آئے ہیں۔

سیاست یہ تھے وہ اخلاقیات جو فاتحانہ رعب داب کے ساتھ آئے اور ہم پر حکمران ہوئے۔ اب اُس سیاسی نظام کو لیجیے جو یہاں قائم کیا گیا اور مغربی آقاؤں کی رہنمائی میں پروان چڑھا۔ اس کی بنیاد تین اصولوں پر قائم کی گئی تھی۔ ایک سیکولرزم یعنی لادینی۔ دوسرے نیشنلزم یعنی قوم پرستی۔ تیسرے ڈیموکریسی، یعنی حاکمیتِ جمہور۔

پہلے اصول کا مطلب یہ تھا کہ مذہب اور اس کے خدا اور اس کی تعلیمات کا کوئی تعلق سیاسی و اجتماعی معاملات سے نہیں ہے۔ اہلِ دنیا اپنی دنیا کے معاملات خود اپنی صوابدید کے مطابق چلانے کے مختار ہیں۔ جس طرح چاہیں چلائیں اور انہیں چلانے کے لیے جو اصول، قوانین، نظریے اور طریقے چاہیں بنالیں۔ خدا کو نہ ان معاملات میں بولنے کا کوئی حق، اور نہ ہمیں اس سے یہ پوچھنے کی ضرورت کہ وہ کیا پسند کرتا ہے اور کیا پسند نہیں کرتا۔ البتہ اگر کوئی بڑی مصیبت کبھی ہم پر ٹوٹ پڑے تو یہ بات سیکولرزم کے خلاف نہیں ہے کہ ایسے وقت میں خدا کو مدد کے لیے پکارا جائے، اور اس صورت میں خدا پر یہ فرض عائد ہو جاتا ہے کہ ہماری مدد کو آئے۔

دوسرے اصول کا مطلب یہ تھا کہ جس مقام سے خدا کو ہٹایا گیا ہے وہاں قوم کو لا بٹھایا جائے۔ قوم ہی معبود ہو۔ قوم ہی کا مفاد معیارِ خیر و شر ہو۔ قوم ہی کی ترقی اور اس کا وقار اور دوسروں پر اس کا غلبہ مطلوب و مقصود ہو۔ اور افراد کی ہر قربانی قوم کے لیے جائز بھی ہو اور واجب بھی۔ اس کے ساتھ "قومیت" کا جو

تصور ہمارے بیرونی آقاؤں نے یہاں درآمد کیا وہ غیر مذہبی، وطنی قومیت کا تصور تھا جس کے ساتھ مل کر قوم پرستی کا مسلک کم از کم ہمارے لیے تو کریلا اور نیم چڑھا ہو گیا کیونکہ جس ملک کی آبادی کا ۳/۴ حصہ غیر مسلم ہو اس میں "وطنی قومیت" کی بنیاد پر مذہب قوم پرستی کا رواج صریح طور پر یہ معنی رکھتا تھا کہ یا تو ہم سیدھی طرح ہی نہیں بلکہ پُر جوش طریقہ سے نامسلمان بنیں، یا پھر مذہب قوم پرستی کی رو سے کافر یعنی غدارِ وطن قرار پائیں۔

تیسرے اصول کا مطلب یہ تھا کہ قومی ریاست میں جس مقام سے مذہب کو بے دخل کیا گیا ہے وہاں جمہورِ قوم یعنی اکثریت کی رائے کو اس کا جانشین بنایا جائے۔ اکثریت، مذہب سے قطع نظر کرتے ہوئے، جسے حق کہے وہ حق اور جسے باطل کہے وہ باطل۔ اکثریت ہی کے بنائے ہوئے اصول اور قوانین اور ضوابط، قوم کا دین ہوں اور اکثریت ہی اس دین میں ہر رد و بدل کی مختار ہو۔

فاتح تہذیب کے اثرات

یہ سیاست تھی، یہ اخلاقیات تھے، یہ فلسفے تھے، اور مذہب کے بارے میں یہ خیالات تھے اُن لوگوں کے جو ہماری تاریخ کے ایک منحوس مرحلے میں باہر سے آکر ہم پر غالب ہوئے۔ ہم اس وقت جن کمزوریوں میں مبتلا تھے وہ آپ پہلے سن چکے ہیں۔ اور یہ لوگ جو تہذیب لائے تھے وہ یہ تھی جس کی تصویر ابھی آپ نے ملاحظہ فرمالی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ تہذیب یہاں اس حیثیت سے نہیں آئی تھی کہ کچھ مسافر یا کچھ سیاح اسے لائے تھے۔ یہ اُن لوگوں کی تہذیب تھی جو یہاں حکمراں بن کر آئے تھے جن کو یہاں کی پوری زندگی پر وہ تسلط حاصل ہوا تھا جو ان سے پہلے کبھی اس ملک کی کسی حکومت کو نصیب نہ ہوا تھا جن کا وہ رعب ——— ذہنی اور مادی، دونوں طرح کا رعب ——— یہاں کی آبادی پر پڑا تھا جو شاید پہلے کسی حکمراں گروہ کا نہ پڑا تھا جن کے قبضے میں نشر و اشاعت اور تعلیم کے وسیع ذرائع بھی تھے، قانون اور عدالت کے کارگر ہتھیار بھی تھے، اور اس کے ساتھ معاش کے وسائل کو بھی ان کے اقتدار نے پوری طرح اپنی گرفت میں لے رکھا تھا۔ اس لیے ان کی تہذیب نے ہم پر ایسا ہمہ گیر اثر ڈالا جس کی گیرائی سے ہماری زندگی کا کوئی شعبہ بچا۔ انہوں نے اپنی تعلیم ہم پر مسلط کی، اور اس طرح مسلط کی کہ رزق کی کنجیاں ہی لے کر اپنی تعلیم گاہوں

کے دروازوں پر لٹکا دیں جس کے معنی یہ تھے کہ اب یہاں رزق وہی پائے گا جو یہ تعلیم حاصل کریگا۔ اس دباؤ میں آکر ہماری ہر نسل کے بعد دوسری نسل پہلے سے بڑھ چڑھ کر ان تعلیم گاہوں کی طرف گئی اور وہاں وہ سارے ہی نظریات اور عملیات سیکھے جن کی روح اور شکل بالکل ہماری تہذیب کی ضد تھی۔ اگرچہ کھلا کافر تو وہ ہم میں سے ایک فی الاکھ کو بھی نہ بنا سکے، مگر فکر و نظر اور ذوق و وجدان اور سیرت و کردار میں ٹھیٹھ مسلمان انہوں نے شاید ۲ فی صدی کو بھی نہ رہنے دیا۔ یہ سب سے بڑا نقصان تھا جو انہوں نے ہم کو پہنچایا۔ کیونکہ اس نے ہمارے دلوں اور دماغوں میں ہماری تہذیب کی جڑوں ہی کو خشک کر دیا اور ایک دوسری مخالف تہذیب کی جڑیں ان میں پیوست کر دیں۔

انہوں نے اپنا معاشی نظام اپنے معاشی فلسفے اور نظریات سمیت ہم پر مسلط کیا، اور اس طرح مسلط کیا کہ رزق کے دروازے بس اسی شخص کے لیے کھل سکتے تھے جو اس معاشی نظام کے اصول اختیار کرے۔ اس چیز نے پہلے ہم کو حرام خور بنایا، پھر رفتہ رفتہ ہمارے ذہنوں سے حرام و حلال کی تمیز مٹائی، اور پھر نوبت یہاں تک پہنچا دی کہ ہم میں سے ایک کثیر تعداد کو اسلام کی ان تعلیمات ہی پر اعتقاد نہ رہا جن میں اس نے اُن بہت سے طریقوں کو حرام قرار دیا تھا جنہیں مغرب کے قائم کیے ہوئے معاشی نظام نے حلال ٹھیرا رکھا ہے۔

انہوں نے اپنے قوانین ہم پر مسلط کیے اور ان سے صرف عملاً ہی ہمارے نظام تمدن و معاشرت کی شکل و صورت کو تبدیل نہ کیا، بلکہ ہمارے اجتماعی تصورات اور ہمارے قانونی نظریات کو بھی بہت کچھ بدل ڈالا۔ جو شخص قانون کے متعلق کچھ بھی واقفیت رکھتا ہے وہ اس بات کو جانتا ہے کہ اخلاق اور معاشرے سے اس کا نہایت گہرا تعلق ہے۔ انسان جب کبھی کوئی قانون بناتا ہے، اس کے پیچھے لازماً اخلاق اور معاشرت اور تمدن کا کوئی فلسفہ ہوتا ہے، اور اس کے پیش نظر کوئی خاص نقشہ ہوتا ہے جس پر وہ انسانی زندگی کو ڈھالنا چاہتا ہے۔ اسی طرح جب وہ کسی قانون کو منسوخ کرتا ہے تو گویا اُس اخلاقی نظریے اور اُس تمدنی فلسفے کو منسوخ کرتا ہے جس پر پچھلا قانون مبنی تھا، اور زندگی کے اُس نقشے کو بدلتا ہے جو اس قانون سے بنا تھا۔ پس جب ہمارے انگریز حکمرانوں نے یہاں آکر ان تمام شرعی قوانین کو منسوخ

کیا جو اس ملک میں رائج تھے اور ان کی جگہ اپنے قوانین نافذ کیے، تو اس کے معنی صرف اسی قدر نہ تھے کہ ایک قانون کی جگہ دوسرا قانون جاری ہُوا، بلکہ اس کے معنی یہ تھے کہ ایک نظامِ اخلاق اور نظامِ تمدن پر خطِ نسخ پھیرا گیا اور اس کی جگہ دوسرے نظامِ اخلاق و تمدن کی داغ بیل ڈالی گئی۔ اس تغیر و تبدل کو مستحکم کرنے کے لیے انہوں نے یہاں کے لا کالجوں میں اپنی قانونی تعلیم رائج کی جس نے دماغوں میں یہ خیال بٹھایا کہ پچھلا قانون ایک دقیانوسی قانون تھا جو زمانۂ جدید کی ایک سوسائٹی کے لیے کسی طرح موزوں نہیں؛ اور یہ نیا طرزِ قانون سازی اپنے اصول و نظریات سمیت زیادہ صحیح اور زیادہ ترقی یافتہ ہے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ انہوں نے ہمارے اس بنیادی عقیدے تک کو متزلزل کر دیا کہ قانون سازی کے اختیارات اللہ تعالیٰ کے لیے خاص ہیں۔ اس کے بجائے انہوں نے یہ بات لوگوں کے ذہن نشین کی کہ اللہ کو اس معاملے سے کچھ سروکار نہیں، یہ لیجسلیچر کا کام ہے کہ جو کچھ چاہے فرض، واجب، یا حلال ٹھیرائے اور جو کچھ چاہے جُرم یا حرام قرار دے۔ پھر اِن نئے قوانین نے جس طرح ہمارے اخلاق و تمدن پر اثر ڈالا اس کا اندازہ کرنے کے لیے صرف اتنی بات کافی ہے کہ یہی قوانین تھے جنہوں نے زنا اور قمار اور شراب اور بہت سی بیوعِ فاسدہ کو حلال کیا، جن کی حمایت و حفاظت میں طرح طرح کے فواحش اور معاصی نے یہاں رواج پایا، اور جن کی حمایت سے محروم ہو کر بہت سی وہ بھلائیاں بھی مٹتی چلی گئیں جو دورِ انحطاط تک میں ہمارے اندر بچی رہ گئی تھیں۔ مگر حالات نے ہماری دینی حِس کو ایسا کُند کر کے رکھ دیا کہ ہمارے بڑے بڑے صلحاء و اتقیاء تک کو اس قانونی نظام کے تحت کسی مسلمان کے وکیل اور جج بننے میں مضائقہ نظر نہ آیا، بلکہ نوبت یہاں تک پہنچی کہ جنہوں نے اس کے مقابلہ میں اَلحُکمُ لِلّٰہ کے اصول کو تازہ کرنا چاہا وہ ہمارے ہاں خارجی قرار پائے۔

انہوں نے اپنے اخلاقی مفاسد اور معاشرتی طور طریقے ہم پر مسلط کیے، اور اس طرح مسلط کیے کہ ان کے ہاں تقرب کا مقام اور تقدم کا شرف اُن لوگوں کے لیے مخصوص رہا جو اخلاق میں ان سے قریب تر اور معاشرت میں ان کے ہم رنگ ہوں۔ یہی چیز اثر و رسوخ اور معاشی خوشحالی اور مادّی ترقی کی ضامن تھی۔ اس لیے رفتہ رفتہ ہمارے اونچے طبقے، اور ان کے پیچھے متوسط طبقے اس رنگ میں رنگتے چلے گئے،

اور آخر میں تصاویر، سینما، ریڈیو، اور سربر آوردہ لوگوں کی زندہ مثالوں نے یہ وبا عوام تک بھی پھیلانی شروع کر دی۔ یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ ایک صدی کے اندر ہم پھسلتے پھسلتے اس مقام پر پہنچ گئے ہیں کہ ہمارے ہاں مخلوط تعلیم کا رواج گوارا کیا جا رہا ہے، اچھے اچھے گھرانوں کی خواتین رقص اور مے نوشی میں مبتلا ہو رہی ہیں، شریف زادیاں ایکٹرسیں بن کر وہ بے حیائی دکھا رہی ہیں جس کے لیے کبھی ہمارے ہاں کی طوائف بھی تیار نہ تھی، اور ہزاروں کے مجمعے اپنی بہنوں اور بیٹیوں کو پریڈیں کرتے دیکھتے ہیں اور ان کو دادِ تحسین دیتے ہیں۔ اب وہ منزل کچھ دور نہیں ہے جہاں پہنچ کر اہلِ مغرب کی طرح ہمارے ہاں بھی یہ سوال اٹھے گا کہ کنواری ماں اور حرامی بچے میں آخر عیب کیا ہے؛ کیوں نہ معاشرے میں انہیں بھی مادرِ منکوحہ اور بچۂ حلال کی طرح عزت کا مقام دیا جائے؟ مغرب بھی اس مقام پر ایک دن میں نہ پہنچا تھا۔ انہی منازل سے گزرتا ہوا پہنچا تھا جن سے ہم گزر رہے ہیں۔

پھر انہوں نے اپنے سیاسی نظریے اور سیاسی ادارے بھی ہم پر مسلط کیے جو ہمارے دین اور ہماری دنیا کے لیے کسی دوسری چیز سے کم غارت گر ثابت نہ ہوئے۔ اُن کے سیکولرزم نے ہمارے دینی تصورات کی جڑیں کھوکھلی کیں، اور ان کے نیشنلزم اور اُن کی ڈیموکریسی نے ہم کو مسلسل ایک صدی تک اتنا پیسا کہ آخر کار ہمیں اپنی آدھی قوم کو دے کر اور اپنی لاکھوں جانیں اور بے شمار عورتوں کی عصمتیں قربان کر کے صرف اپنی آدھی قوم کو اِس چکّی کے پاٹوں سے بچا لینے پر آمادہ ہونا پڑا۔ اِن بے درد احمقوں نے ایک لمحہ کے لیے بھی یہ نہ سوچا کہ ہندوستان کے یہ ہندو اور مسلمان اور سکھ اور اچھوت مل کر جدید سیاسی معنوں میں ایک قوم کیسے قرار پا سکتے ہیں جس میں ڈیموکریسی کا یہ اصول چل سکے کہ قوم کی اکثریت قانون ساز اور حکمران ہو اور اقلیت رائے عام کو ہموار کر کے اکثریت بننے کی کوشش کرتی رہے؟ انہوں نے کبھی یہ سمجھنے کی کوشش نہ کی کہ یہاں کی اقلیتیں اور اکثریتیں قومی اقلیتیں اور اکثریتیں ہیں نہ کہ محض سیاسی۔ انہوں نے، جن پر ۳۵ کروڑ انسانوں کے حال و مستقبل کی بھاری ذمہ داری تھی، اپنا ایک منٹ بھی اس معاملے کو سمجھنے پر صرف نہ کیا کہ ان مختلف قوموں کے مجموعے کو ایک قوم فرض کر کے یہاں سیکولر ڈیموکریسی قائم کرنے کے معنی اس کے سوا کچھ نہیں ہو سکتے کہ ان میں سے ایک کثیر التعداد

قوم باقی سب قوموں کے مذہب، تہذیب اور قومی انفرادیت کو زبردستی مٹا کر رکھ دے۔ وہ اندھا دُھند اپنے گھر کے اصول اور نظریات اور عملی طریقے ایک بالکل مختلف ماحول پر ٹھونستے چلے گئے۔ ہندوستان کا چپہ چپہ برسوں منافرت کا زہر اور مظلوموں کا خون اور جان گسل کشمکش کا دھواں اگل اگل کر خبر دیتا رہا کہ یہ بالکل ایک غلط نظام ہے جو اس آبادی کے مزاج کے خلاف اس پر مسلط کیا جا رہا ہے۔ مگر انہوں نے اس کا نوٹس تک نہ لیا۔ ایک دیوار بیچ کے ہمسائے ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو گئے۔ مگر انہوں نے اپنی پالیسی پر نظرِ ثانی کرنے کی ضرورت محسوس نہ کی۔ پھر جب نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ تقسیم کے سوا کوئی چارہ باقی نہ رہا تو وہ ایسے طریقے سے تقسیم کر کے رخصت ہوئے جس کی بدولت خون کے دریا اور لاشوں کے پہاڑ ہندوستان و پاکستان کی سرحد بنے، اور یہ تقسیم پچھلے جھگڑوں کے تصفیے کی ایک شکل بننے کے بجائے بہت سے نئے جھگڑوں کی بنیاد بن گئی جو نہ معلوم کتنی مدت تک اس برِ عظیم کے لوگوں کو آپس کی دشمنی اور کشمکش میں مبتلا رکھیں گے۔

مَیں مانتا ہوں کہ ان بیرونی حاکموں نے یہاں کچھ اچھے کام بھی کیے۔ اُن کی بدولت جو مادی ترقیات یہاں ہوئیں اور علومِ جدیدہ کے مفید پہلوؤں سے جو فائدہ ہمیں پہنچا، اُن کی قدر و قیمت سے مجھے انکار نہیں ہے۔ مگر کیا نسبت ہے اِن فائدوں کو اُن بے شمار اخلاقی، روحانی اور مادی نقصانات سے جو ہمیں ان کی بالادستی سے پہنچ گئے؟

ہمارا ردِّ عمل

اِس کے بعد ہمیں جائزہ لے کر دیکھنا ہے کہ اِس غالب تہذیب کے ہجوم کا ردِّ عمل ہمارے ہاں کس کس شکل میں ہُوا اور آج اس کے کیا اچھے اور بُرے اثرات ہم اپنی قومی زندگی میں پاتے ہیں۔ مجموعی طور پر یہاں اس کے مقابلے میں دو بالکل مختلف قسم کے ردِّ عمل ہوئے ہیں جن میں سے ہر ایک کے نہایت وسیع اور عمیق اثرات مترتب ہوئے اور ہو رہے ہیں۔ میں پہلے ان دونوں کا الگ الگ حساب آپ کے سامنے پیش کروں گا، اور پھر ان کا حاصلِ جمع بھی آپ کے سامنے رکھ دوں گا۔

انفعالی ردِّ عمل ہم میں سے ایک گروہ کا ردِّ عمل یہ تھا کہ یہ طاقت ور اور ترقی یافتہ قوم جو ہم پر

حکمراں بن کر آئی ہے، اس سے وہ سب کچھ لے لو جو یہ دے رہی ہے اور اس کے وہ سارے اثرات قبول کرتے چلے جاؤ جو یہ ڈال رہی ہے۔ جو تعلیم یہ دیتی ہے اسے حاصل کرو۔ جو معاشی نظام یہ قائم کر رہی ہے اسے اپنا لو۔ جو قوانین یہ نافذ کر رہی ہے انہیں مان لو۔ جو معاشرت یہ لائی ہے اس کے رنگ میں رنگ جاؤ۔ اور جو سیاسی نظام یہ قائم کر رہی ہے اسے بھی تسلیم کر لو۔

اس ردّ عمل میں مرعوبیت اور شکست خوردگی کی روح تو ابتدا ہی سے تھی۔ تاہم اوّل اوّل اس کا محرک یہ خیال تھا کہ مغلوب و محکوم ہو جانے کے بعد اب مزاحمت ہمارے لیے ممکن نہیں ہے، مزاحمت کریں گے تو ہر حیثیت سے نقصان میں رہیں گے، لہٰذا ہمارے لیے اس کے سوا اب کوئی چارہ کار نہیں ہے کہ زندگی اور ترقی کے جو مواقع اس نئے نظام میں حاصل ہو سکتے ہیں، ان سے فائدہ اٹھایا جائے۔ لیکن اس دلیل ـــ اور اپنی جگہ اچھی خاصی باوزن دلیل ـــ سے متاثر ہو کر ہمارے جو عناصر اس راہ پر گئے ان کی پہلی ہی نسل میں وہ نقصانات نمایاں ہونے شروع ہو گئے جو ایک مخالف تہذیب کے مقابلہ میں قبولیت و انفعال کا رویہ اختیار کرنے سے کسی قوم کو پہنچ سکتے ہیں۔ اور پھر ہر نسل کے بعد دوسری نسل ان نقصانات میں زیادہ سے زیادہ مبتلا ہوتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ ایک قدر قلیل کے سوا ہمارا طبقہ عالی اور طبقہ متوسط اس وبا سے ماؤف ہو گیا اور اپنے لیڈروں کی دیکھا دیکھی عوام تک اس کا زہر پھیلتا چلا گیا۔

مذہب کے متعلق اہلِ مغرب کا جو نقطۂ نظر تھا، ہمارے نئے تعلیم یافتہ لوگوں کی بڑی اکثریت نے اسے قریب قریب جوں کا توں قبول کیا اور یہ تک محسوس نہ کیا کہ مغرب نے مذہب کو جو کچھ سمجھا تھا وہ مسیحیت اور کلیسا کو دیکھ کر سمجھا تھا نہ کہ اسلام کو۔ وہ اس پورے اندازِ فکر کو اخذ کر بیٹھے جو اہلِ کلیسا کی ضد میں مذہب اور اس سے تعلق رکھنے والے مسائل و معاملات کے متعلق مغرب میں پیدا ہوا تھا۔ انہوں نے سمجھا کہ اسلام اور اس کی ہر چیز ہر شک کی مستحق ہے اور دلیل و ثبوت کی ضرورت اگر ہے تو اس کی کسی بات کے لیے ہے، نہ کہ ان نظریات کے لیے جو علم کے نام سے کوئی مغربی فلسفی یا سائنس داں یا ماہر علوم عمران پیش کر دے۔ انہوں نے مغرب کے اس خیال کو بھی بلاتنقید مان لیا کہ مذہب فی الواقع ایک پرائیویٹ معاملہ ہے اور اجتماعی زندگی سے اس کو کچھ سروکار نہ ہونا چاہیے۔ یہ خیال ان کے ذہن میں کچھ اس طرح اتر گیا

کہ آج جو لوگ بے سوچے سمجھے اس چلتے ہوئے فقرے کو بار بار دُہراتے ہیں کہ "اسلام ایک مکمل نظامِ زندگی ہے" وہ بھی ہر وقت اپنے ہر طرزِ عمل سے یہ ثابت کرتے رہتے ہیں کہ اسلام صرف ایک پرائیویٹ مذہب ہے جس سے پبلک معاملات میں کچھ پوچھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ بلکہ ان میں سے اکثر و بیشتر لوگوں کے لیے اسلام ایک پرائیویٹ مذہب بھی نہیں رہا، کیونکہ ان کی اپنی شخصی زندگی بجز اقرارِ اسلام اور ختنہ و نکاح کے اسلام کی پیروی کا کوئی اخلاقی یا عملی نشان اپنے اندر نہیں رکھتی۔ ان میں سے جن لوگوں میں مذہبیت کی طرف میلان باقی بھی رہا، یا پیدا بھی ہوا، تو زیادہ تر اس نے یہ شکل اختیار کی کہ مغرب اور اس کے فلسفوں اور نظریات اور عملیات کو معیارِ حق مان کر اسلام اور اس کے عقائد اور اس کے نظامِ زندگی اور اس کی تاریخ کی مرمت شروع کر دی گئی، اور کوشش کی گئی کہ اسلام کی ہر چیز کو اس معیار پر ڈھال لیا جائے، اور جو نہ ڈھل سکے اس کو ریکارڈ سے محو کر دیا جائے، اور جو محو بھی نہ ہو سکے اس کے لیے دنیا کے سامنے معذرتیں پیش کی جائیں۔

ان کی عظیم اکثریت نے مغرب کے فلسفۂ زندگی، اور مغربی تہذیب کی فلسفیانہ بنیادوں کو بھی بجنسہٖ اخذ کیا اور اس پر کسی تنقید کی ضرورت نہ محسوس کی۔ یہ لازمی نتیجہ تھا اس تعلیم کا جو انہیں ابتدائی مدارج سے لیکر آخری مراتب تک مدرسوں اور کالجوں میں دی گئی۔ تاریخ، فلسفہ، معاشیات، سیاسیات، قانون، اور دوسرے علوم کو جس طرز پر انہوں نے پڑھا اُس سے وہی ذہنیت بن سکتی تھی جو خود ان کے مغربی استادوں کی تھی، اور دنیا اور اس کی زندگی کے متعلق ان کا نقطۂ نظر وہی کچھ ہو سکتا تھا جو اہلِ مغرب کا تھا۔ خدا اور آخرت کا علانیہ انکار تو کم ہی لوگوں نے کیا، مگر ہمارے ہاں اس تعلیم سے متاثر ہونے والوں میں ایسے لوگ بھی آخر کتنے پائے جاتے ہیں جو مادّہ پرستانہ ذہنیت اور فکرِ آخرت سے بے نیاز نظریۂ حیات نہیں رکھتے؟ جو ان دیکھی غیر محسوس حقیقتوں کی بھی کچھ حقیقت سمجھتے ہیں؟ جن کی نگاہ میں مادّی قدروں سے بلند تر روحانی قدروں کی بھی کچھ وقعت ہے؟ اور جو دنیا کو اغراضِ نفسانی کی ایک بے دردانہ کشمکش کا میدانِ جنگ نہیں سمجھ رہے ہیں؟

اخلاق کے معاملہ میں اِس انفعالی ردّعمل کا نتیجہ اس سے بھی بدتر ہوا۔ اپنے دورِ انحطاط

میں ہمارے اخلاق کی جڑیں بوسیدہ تو پہلے ہی ہو چکی تھیں۔ ہمارے امرا اور اہلِ دولت پہلے سے عیش کوش تھے ہمارے متوسط طبقے کرائے کے سپاہی اور بھاڑے کے ٹٹو پہلے ہی سے بنے ہوئے تھے۔ ہمارے اندر کوئی مستقل اور مخلصانہ وفاداری پہلے ہی موجود نہ تھی۔ پھر جب اس کے ساتھ مغرب کے فلسفۂ اخلاق کا جوڑ لگا تو یہاں وہ سیرتیں پیدا ہونی شروع ہوگئیں جو مغربی سیرت کے تمام بُرے پہلوؤں کی جامع اور اس کے اکثر روشن پہلوؤں سے خالی ہیں۔ افادیت اور لذت پرستی اور بے اصولی میں تو ہمارے ہاں کی مغرب زدہ سیرت اسی سطح پر ہے جس پر خود اہلِ مغرب کی سیرت پہنچی ہوئی ہے۔ مگر وہاں کوئی مقصد زندگی ہے جس کے لیے سخت کوشی و جانفشانی کی جاتی ہے، اور یہاں کسی مقصد زندگی کا پتہ نہیں۔ وہاں کوئی نہ کوئی ایسی وفاداری موجود ہے جس میں اخلاص پایا جاتا ہے جسے بیچا اور خریدا نہیں جا سکتا، مگر یہاں سب کچھ قابلِ فروخت ہے اور ہر شے کا تبادلہ روپے یا ذاتی مفاد سے کیا جا سکتا ہے۔ وہاں کچھ بداخلاقیاں صرف غیر قوموں کے مقابلہ میں برتنے کے لیے مخصوص ہیں جن کا ارتکاب اپنی قوم کے خلاف کرنا گناہِ عظیم سمجھا جاتا ہے، مگر یہاں جھوٹ، مکر، دھوکے، بدعہدی، خود غرضی، سازش اور تحریص و تخویف کے ہتھیار خود اپنی قوم کے خلاف استعمال کر ڈالنے میں بھی مضائقہ نہیں ہے۔ امریکہ یا انگلستان میں کوئی یہ اخلاق برتنے تو اس کا جینا مشکل ہو جائے، مگر یہاں بڑی بڑی جماعتیں ان اخلاقیات کے بل پر اٹھتی اور فروغ پاتی ہیں، اور جو لوگ ان اوصاف میں اپنی مہارت ثابت کر دیتے ہیں اُن کے متعلق سمجھا جاتا ہے کہ قیادتِ ملی کے لیے یہی موزوں ترین اشخاص ہیں۔

معاشرت اور معیشت اور قانون کے بارے میں مغربی تسلط کے جن اثرات کا ابھی ابھی میں آپ سے ذکر کر چکا ہوں ان سب کو قبول کرنے والے اور انہیں لے کر اپنی قوم میں پھیلانے والے بھی وہی لوگ تھے اور ہیں جنہوں نے اِس انفعالی ردِّ عمل کی راہ اختیار کی۔ تاہم ان میں سے کوئی چیز بھی اس قدر حیرت انگیز نہیں ہے جس قدر انگریزوں کے قائم کیے ہوئے سیاسی نظام کے معاملے میں ان کا ردِّ عمل حیرت انگیز ہے۔ اس گروہ کو سب سے زیادہ ناز اپنی سیاسی سوجھ بوجھ پر ہے، مگر انہوں نے سب سے بڑھ کر اپنی نااہلی کا ثبوت اِسی معاملے میں دیا ہے۔ جس سیکولرزم، نیشنلزم اور ڈیموکریسی پر ہندوستان کے سیاسی نظام

کی بنا رکھی گئی تھی اور جس پر انیسویں صدی کے نصف آخر سے مسلسل اس کا ارتقا ہو رہا تھا۔ اس کو اگر ہندوؤں نے تسلیم کیا تو یہ ایک امر طبعی تھا، کیونکہ اس کا ہر جُز ان کے لیے مفید تھا۔ لیکن مسلمان، جن کے لیے اس کا ہر جُز تباہ کن تھا، اُن کا اس سیاسی نظام کے بنیادی اصولوں کو چیلنج نہ کرنا اس بات کا کھلا ثبوت ہے کہ ان کے نئے تعلیم یافتہ لوگوں نے سیاست پڑھی چاہے کتنی ہی ہو، اسے سمجھا کبھی نہیں۔ وہ مغرب سے اتنے مرعوب تھے کہ جو کچھ وہاں سے آتا اسے وحی آسمانی سمجھ کر قبول کر لیتے تھے اور کسی چیز کو تنقید کی کسوٹی پر کس کر دیکھنے کی انہیں ہمت نہ ہوتی تھی۔ اسی شکست خوردہ ذہنیت کے ساتھ انہوں نے سیاست پڑھی اور نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے تمام نظریات کو بھی آنکھیں بند کر کے مانتے چلے گئے۔ ان کے اندر نہ اتنی عقل تھی کہ اس سیاسی نظام کی بنیادوں کو جانچ کر دیکھتے اور نہ اتنی جرأت تھی کہ علمی حیثیت سے اُن بنیادوں کو چیلنج کر سکتے اور اپنے آقاؤں سے یہ کہہ سکتے کہ تمہارے یہ اصول اس ملک میں نہیں چل سکیں گے۔ انہوں نے آدھی جنگ تو اسی روز ہار دی تھی جبکہ سیکولرزم، نیشنلزم اور ڈیموکریسی کے ان اصولوں کو اصول برحق مان لیا۔ اس کے بعد نہ ان کی یہ پالیسی چل سکی کہ سیاسی ارتقاء کی رفتار اور اہلِ ملک کی طرف اختیارات کے انتقال کو روکا جائے، اور نہ یہی پالیسی کامیاب ہوئی کہ اس سراسر غلط سیاسی نظام میں مسلمانوں کو ایسے تحفظات حاصل ہو جائیں جو اس کے تباہ کن اثرات سے انہیں بچا سکیں۔ آخر کار جب وہ سیاسی نظام پختہ ہو کر اپنے تکمیلی مرحلے میں پہنچ گیا تو ہمیں چار و ناچار اس پر راضی ہونا پڑا کہ ہم میں سے آدھے قبر میں جائیں اور آدھے بچ نکلیں! اس پر بھی ہمارے سیاسی رہنماؤں کی سمجھ میں اب تک یہ نہیں آیا ہے کہ جس سیاسی نظام نے ہم کو قبر تک پہنچا دیا اس کی بنیادوں میں کیا نقائص ہیں۔ چنانچہ وہ آج بھی اُس نظام کو انہی بنیادوں کے ساتھ جوں کا توں باقی رکھے ہوئے ہیں اور اس کو بدلنے کی ضرورت کا کوئی احساس ان کے اندر نہیں پایا جاتا۔ اب ایک کند ذہن آدمی کے سوا کون یہ باور کر سکتا ہے کہ سیاست کے مطالعے اور تجربے نے کوئی سیاسی بصیرت ان لوگوں میں پیدا کی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ یہ انفعالی ردعمل سراسر نقصان ہی نہ تھا۔ اس میں فائدے کے پہلو بھی کچھ تھے۔ اس سے ہمارا پچھلا جمود ٹوٹا۔ ہم موجودہ زمانے کی ترقیات سے آشنا ہوئے۔ ہمارے نقطۂ نظر میں

وسعت پیدا ہوئی۔ ہم اُس شدید نقصان سے بچ گئے جو صرف غیر مسلموں کے جدید تعلیم پانے اور حکومت کے نظم ونسق میں دخیل ہوجانے سے پہنچ سکتے تھے۔ ہمارے بہت سے آدمیوں کو حکومت کے مختلف شعبوں کا تجربہ حاصل ہوا۔ ان فائدوں میں سے کسی کا بھی میں منکر نہیں ہوں۔ مگر اس کے ساتھ یہ بھی تو واقعہ ہے کہ اس کی بدولت ہمارا تصورِ دین بدلا، تصورِ اخلاق بدلا، فلسفۂ زندگی بدلا، ہماری قدریں متغیّر ہوئیں، ہماری انفرادی سیرت اور اجتماعی تہذیب کی بنیادیں متزلزل ہوگئیں، اور ہم اسلاف کی اندھی تقلید سے نکل کر اغیار ــــ اور گمراہ و بدکردار اغیار ــــ کی اندھی تقلید میں مبتلا ہو کر رہ گئے جس نے ہمیں دینی حیثیت سے بھی تباہ کیا اور دنیوی حیثیت سے بھی۔

جمودی ردِ عمل

ہمارے ہاں ایک دوسرے گروہ کا ردِ عمل اس کے بالکل برعکس تھا۔ پہلا گروہ اگر آنے والے سیلاب میں بہ نکلا تو یہ دوسرا گروہ اس کے آگے جمود کی چٹان بن کر بیٹھ گیا۔ اس نے کوشش کی کہ علم اور مذہب اور اخلاق اور معاشرت اور روایات کی اُس پوری میراث کو جو اٹھارویں صدی کے لوگوں نے چھوڑی اور انیسویں صدی کے لوگوں نے پائی تھی ــــ اس کے تمام صحیح و غلط اجزاء سمیت ــــ جوں کا توں باقی رکھا جائے، اور نئی فاتح تہذیب کا نہ کوئی اثر قبول کیا جائے، نہ اس کے سمجھنے ہی میں اپنا وقت ضائع کیا جائے۔ اس گروہ کے لوگوں نے آثارِ قدیمہ کے تحفظ کا جو رویّہ مغربی تہذیب سے پہلا تصادم پیش آنے کی ساعت میں اختیار کیا تھا، اس پر وہ آج تک بلا کسی ترمیم و نظرِ ثانی کے قائم ہیں۔ انہوں نے اپنا ایک لمحہ بھی سنجیدگی کے ساتھ اس کام میں صرف نہ کیا کہ اگلوں کی میراث کا تجزیہ کرکے دیکھیں کہ اس میں کیا باقی رکھنے اور کیا بدلنے کے لائق ہے۔ نہ انہوں نے کبھی سنجیدگی کے ساتھ اسی سوال پر غور کیا کہ آنے والی تہذیب کیا کچھ لینے کے قابل اور کیا کچھ چھوڑ دینے کے قابل لائق ہے۔ اور نہ انہوں نے کبھی یہ سمجھنے کی کوئی معقول کوشش کی کہ ہمارے نظامِ فکر و عمل میں وہ کیا خامیاں تھیں جو ہماری شکست کی موجب ہوئیں اور ہزارہا میل کے فاصلہ سے آئی ہوئی ایک قوم کے پاس علم و عمل کی وہ کیا طاقت ہے جو اس کے غلبے کا سبب بن گئی۔ ان امور کی طرف توجہ کرنے کے بجائے انہوں نے اپنا سارا زور حالتِ سابقہ کو برقرار رکھنے پر صرف کیا اور آج تک کیے جا رہے ہیں۔ ان کا

نظامِ تعلیم اور نصابِ تعلیم وہی ہے جو انیسویں صدی کے آغاز میں تھا۔ ان کے مشاغل وہی ہیں ان کے مسائل وہی ہیں۔ ان کا اندازِ فکر وہی ہے۔ ان کا طریق کار وہی ہے۔ اور ان کے ماحول کی خصوصیات وہی ہیں۔ جو کچھ اُس میں اچھائیاں تھیں وہ بھی محفوظ ہیں۔ اور جو کچھ اُس میں خامیاں تھیں وہ بھی محفوظ ہیں۔

مَیں مانتا ہوں کہ اس ردّ عمل کے اندر فائدے کا ایک قیمتی پہلو تھا اور ہے۔ وہ جتنا قابلِ قدر ہے اس کی اتنی ہی قدر میرے دل میں ہے۔ ہمارے ہاں جو کچھ بھی قرآن و حدیث اور فقہ کا علم بچا رہ گیا ہے اسی کی بدولت بچا ہے۔ ہمارے بزرگوں نے دین و اخلاق کی جو میراث چھوڑی تھی، بسا غنیمت ہے کہ کچھ لوگ اس کو سنبھال کر بیٹھ گئے اور آئندہ نسلوں کی طرف اس کو منتقل کرتے رہے۔ ہماری تہذیب کی جو اہم خصوصیات تھیں، نہایت قیمتی خدمت ہے کہ کسی نے ان کی حفاظت کی کوشش کی اور سخت مخالف ماحول میں ان کو تھوڑا یا بہت برقرار رکھا۔

میں یہ بھی مانتا ہوں کہ جن لوگوں نے اس ردّ عمل کی ابتدا کی وہ بڑی حد تک معذور تھے۔ جس وقت تہذیبِ مخالف کے سیلاب سے ان کو اچانک تصادم پیش آیا اُس وقت شاید وہ اِس سے زیادہ کچھ نہ کر سکتے تھے کہ اپنے گھر کی جتنی چیزیں بھی بچا سکتے ہیں بچالیں۔ اس معاملہ میں ان کی معذوری پہلے ردّ عمل کے بانیوں کی معذوری سے کچھ کم درجے کی نہیں ہے۔ ہم پہلے گروہ کے ابتدائی لیڈروں کو بھی یہ الاؤنس دیتے ہیں کہ اجنبی اقتدار کے سیلاب سے پہلا تصادم پیش آنے پر وہ اس کے سوا کچھ نہ سوچ سکتے تھے کہ اپنی قوم کو کامل تباہی سے اور شودروں میں تبدیل ہو جانے سے بچانے کے لیے وہ راہ اختیار کریں جو انہوں نے کی۔ ایسے ہی الاؤنس کے مستحق دوسرے گروہ کے ابتدائی لیڈر بھی ہیں جنہوں نے آغازِ تصادم میں اپنے مذہب اور تہذیب کے باقیات کو مٹنے سے بچانے کی فکر کی۔ مگر قانونِ قدرت میں معذرتیں (Apologies) اور رخصتیں (Allowances) نہیں چلا کرتیں۔ کوئی کام خواہ کسی وجہ سے کیا گیا ہو، اس میں اگر نقصان کا کوئی سبب موجود ہو تو وہ نقصان پہنچ کر ہی رہتا ہے، اور واقعہ میں جو نقصان پہنچا ہو اسے نقصان ماننا ہی پڑتا ہے۔

اس کا پہلا نقصان یہ تھا کہ حالتِ سابقہ کے تحفظ کی کوششوں ۔ دین اور اس سے تعلق رکھنے

والی قابلِ قدر چیزوں کے ساتھ ساتھ اُن تمام کمزوریوں اور خرابیوں کا بھی پورا تحفظ کیا جو ہمارے دورِ انحطاط کے مذہبی تصورات اور مذہبی گروہوں میں موجود تھیں۔ یہ ملی جلی میراث جوں کی توں ہمارے حصہ میں آئی ہے اور اب یہ ایک صحیح اسلامی انقلاب کے راستہ میں ویسی ہی سخت رکاوٹ بن رہی ہے جیسی ہمارے مغربیت زدہ طبقوں کی ذہنیت بن رہی ہے۔

اس کا دوسرا نقصان یہ ہوا کہ ہمارے دین اور اخلاق اور تہذیب کے اصلی جوہر کی حفاظت جیسی ہونی چاہیے تھی، اس کے ذریعہ سے نہ ہو سکی، بلکہ وہ روز افزوں زوال میں مبتلا ہوتا چلا گیا۔ ظاہر ہے کہ سیلابوں کا مقابلہ سیلاب ہی کر سکتے ہیں، چٹانیں نہیں کر سکتیں۔ یہاں کوئی طاقت ایسی نہ تھی جو مغربی تہذیب کے مقابلہ میں اسلامی تہذیب کا کوئی سیلاب اٹھا سکتی۔ یہاں صرف "قدیم کی محافظت" پر اکتفا کیا گیا، اور اس "قدیم" میں اصل قابلِ حفاظت چیزوں کے ساتھ بہت سی ایسی چیزیں بھی شامل رکھی گئیں جو نہ زندگی کی طاقت رکھتی تھیں، نہ اس لائق تھیں کہ ان کی حفاظت کی جاتی اور نہ ان کے شمول سے یہ امید ہی کی جا سکتی تھی کہ ایک مخالف تہذیب کے مقابلہ میں اس سے اسلام کی عزت قائم رہ سکے گی۔ یہی وجہ ہے کہ پچھلے ساٹھ ستر سال کی تاریخ پر جب ہم نگاہ ڈالتے ہیں تو اس دوران میں ہم کو اسلام اور اس کی تہذیب آگے بڑھتی ہوئی نہیں بلکہ مسلسل پسپا ہوتی نظر آتی ہے۔ ہر سال اور ہر مہینے اور ہر دن کے حساب سے وہ دبتی اور سکڑتی رہی ہے اور مغربی تہذیب بڑھتی اور پھیلتی چلی گئی ہے۔ ہر دن جو ہم پر طلوع ہوا، اس طرح طلوع ہوا کہ مغرب کی ذہنی گمراہیوں اور اخلاقی گندگیوں اور عملی بدراہیوں نے ہماری زندگی کے کچھ مزید رقبے پر قبضہ کر لیا اور ہمارے دین اور اخلاق اور تہذیب نے کچھ مزید رقبہ کھو دیا۔ اس رفتار کو ہمارے محافظینِ طرزِ قدیم ایک لمحہ کے لیے بھی نہ روک سکے۔

اس کا تیسرا نقصان یہ ہوا کہ ہمارا مذہبی گروہ اسلام اور غیر اسلامی قدامت کے جس مرکب کی حفاظت کر رہا تھا اس کے اندر فکری اور عملی، دونوں حیثیتوں سے ہمارے اہلِ دولت اور اہلِ دماغ طبقوں کے لیے بہت کم کشش باقی رہ گئی، بلکہ اس کی کشش روز بروز کم ہوتی چلی گئی۔ ایک

طرف مخالف تہذیب دماغوں کو مسخر کرنے والے، دلوں کو موہ لینے والے اور نگاہوں کو خیرہ کر دینے والے ساز و سامان کے ساتھ بڑھی چلی آ رہی تھی۔ دوسری طرف اسلام کی نمائندگی ایسے مباحث، مسائل، مشاغل اور مظاہر کے ذریعہ سے کی جا رہی تھی جو نہ دماغوں کو مطمئن کرتے تھے، نہ دلوں کو اپیل کرتے تھے، نہ نگاہوں کو بھلے لگتے تھے۔ اس وجہ سے مادّی وسائل اور دماغی صلاحیتیں رکھنے والے گروہ دین سے اپنی رہی سہی دلچسپی بھی کھوتے اور مغربی تہذیب میں جذب ہوتے چلے گئے، اور مذہبیت کی میراث سنبھالنے کا کام بتدریج ہمارے اُن طبقوں کے لیے مخصوص ہوتا چلا گیا جو مادّی، ذہنی اور معاشرتی حیثیت سے پست تر تھے۔ اس کا نقصان صرف اتنا ہی نہ ہوا کہ مذہبیت کا محاذ کمزور سے کمزور تر اور مغربیت کا محاذ قوی سے قوی تر ہوتا رہا، بلکہ اس سے کچھ بڑھ کر یہ نقصان ہوا کہ اسلام کی نمائندگی کا معیار، علم و عقل اور زبان و اخلاق، ہر اعتبار سے گرتا ہی چلا گیا یہاں تک کہ دین اور دینداری کی آبرو بچنی مشکل ہو گئی۔

آخری اور سب سے بڑا نقصان اس پالیسی کا یہ ہوا کہ مسلمانوں کی قیادت و رہنمائی سے اہلِ دین بے دخل ہو گئے اور تعلیم، تمدّن، معیشت اور سیاست، ہر معاملے میں مسلمانوں کو راستہ دکھانا اور اپنے پیچھے لے کر چلنا اُن لوگوں کا کام ہو گیا جو نہ دین کو جانتے ہی ہیں اور نہ کوئی قدم دین سے پوچھ کر اٹھانے کی ضرورت ہی محسوس کرتے ہیں۔ انہوں نے ساری تعلیم مغربی طرز پر پائی ہے۔ ان کی زندگیاں مغربی نظامِ معیشت سے بنی ہیں۔ ان کی معاشرت مغربی سانچوں میں ڈھلی ہے۔ ان کے اخلاق مغربی قدروں اور اصولوں پر تعمیر ہوئے ہیں۔ انہوں نے شریعت مغرب کے لاکالجوں سے لی اور اسی کی پریکٹس کی ہے۔ اور انہوں نے سیاست کے سارے اصول اور رنگ ڈھنگ اور جوڑ توڑ مغرب سے سیکھے ہیں۔ اس سرچشمۂ ضلالت سے جو رہنمائی انہوں نے پائی اسی پر وہ چلے اور ساری قوم کو اس پر چلایا اور قوم پورے اعتماد سے ان کے پیچھے چلی۔ اہلِ دین کا اس سارے کاروبار میں اگر کوئی کام رہا تو یہ کہ یا تو گوشہ نشین ہو کر درس و تدریس اور ذکر و تسبیح میں مشغول رہیں، یا قومی قیادت پر جو بھی فائز ہو اس کے دعاگو بن کر رہیں، یا پھر سیاست کے میدان میں آئیں تو کسی

نہ کسی آگے چلنے والے کے پیچھے بے اثر خیمہ بردار کی حیثیت سے چلیں۔ کانگریس ہو یا مسلم لیگ جس کی طرف بھی وہ گئے پیرو بن کر گئے۔ کسی پالیسی کے بنانے میں ان کا کوئی حصہ نہ رہا۔ کسی بڑی سے بڑی گمراہی کو بھی وہ نہ روک سکے نہ اس پر ٹوک ہی سکے۔ ان کا کام اس کے سوا کچھ نہ رہا کہ جو پالیسی بھی دین سے بے نیاز یا دین کے مخالف لیڈر بنا دیں اس کو یہ برکت دیں اور مسلمانوں کو اطمینان دلائیں کہ یہی قرآن و حدیث میں بھی لکھا ہے، یا کم از کم یہ کہ اس میں ان کے دین کے لیے کوئی خطرہ نہیں ہے۔ یہ بیماری بڑھتے بڑھتے یہاں تک پہنچی کہ سیکولرزم تک کو ہماری بہت سی مقدس مذہبی بارگاہوں سے برکت مل گئی۔ بے اثر لوگوں کے معاملے میں تو ان کی دینی حِس اتنی تیز ہے کہ ان کی ساری دینداری پر ایک ڈاڑھی کے طول کی کمی پانی پھیر دیتی ہے، اور چند غیر منصوص فقہی جزئیات میں ان سے ذرا سا اختلاف بھی ہو جائے تو وہ ہادمِ دین قرار پاتے ہیں۔ مگر جن کے پیچھے ایک دفعہ ساری قوم مل کر زندہ باد کا نعرہ لگا دے، یا جن کو سیاسی طاقت نصیب ہو جائے، ان کو یہ تمام رخصتوں کا مستحق سمجھتے ہیں چاہے ان کے ہاتھوں پورے دین کی عمارت ہی متزلزل ہو رہی ہو۔

ہم کیا چاہتے ہیں

حضرات! یہ ہے تفصیلی جائزہ ہماری پچھلی تاریخ کا اور ہماری موجودہ حالت کا۔ یہ جائزہ میں نے کسی کو مطعون کرنے کے لیے نہیں بلکہ اس لیے لیا ہے کہ آپ موجودہ صورتِ حال اور اس کے تاریخی اسباب کی اچھی طرح تشخیص کر لیں اور اُس لائحۂ عمل کو ٹھیک ٹھیک جانچ سکیں جو ہم نے محض اللہ کی توفیق و تائید کے اعتماد پر ان حالات میں پاکستان کی اصلاح کے لیے، اور اس کو بالآخر اسلام کی نشأۃِ ثانیہ کا علمبردار بنانے کے لیے اختیار کیا ہے۔

میری افتتاحی تقریر سے آپ کو معلوم ہو چکا ہے کہ خرابی کا دائرہ کتنا وسیع ہے اور کس طرح ہماری قومی زندگی کے ہر شعبے میں پھیلا ہوا ہے۔ اور اب میری اس تقریر سے آپ یہ بھی معلوم کر چکے ہیں کہ جو خرابیاں بھی آج پائی جاتی ہیں ان میں سے ہر ایک کن کن اسباب سے نشو و نما پاتی ہوئی بتدریج اس حالت تک پہنچی ہے، اور اس کی جڑ ہماری تاریخ اور روایات اور نظامِ تعلیم و تمدن و سیاست میں

کتنی گہری ہے، اور مختلف شعبوں کی یہ ساری خرابیاں کس طرح مل جل کر ایک دوسرے کو سہارا دے رہی ہیں۔ اس کے بعد میں نہیں سمجھتا کہ کسی صاحبِ بصیرت آدمی کو یہ تسلیم کرنے میں کچھ بھی تامل ہوگا کہ ان حالات میں جزوی اصلاح کی کوئی تدبیر نتیجہ خیز نہیں ہو سکتی۔ آپ دینی مدارس کھول کر، یا کلمہ و نماز کی تبلیغ کرکے، یا فسق و فجور کے خلاف وعظ و تلقین کرکے، یا گمراہ فرقوں کے خلاف مورچے لگا کر زیادہ سے زیادہ اگر کچھ حاصل کر سکتے ہیں تو بس یہ کہ دین جس رفتار سے مٹ رہا ہے اس میں کچھ سستی پیدا کر دیں اور دینی زندگی کو سانس لینے کے لیے کچھ دن زیادہ مل جائیں۔ لیکن یہ امید آپ ان تدبیروں سے نہیں کر سکتے کہ اللہ کا کلمہ بلند ہو جائے اور اس کے مقابلے میں جاہلیت کے کلمے پست ہو کر رہ جائیں۔ اس لیے کہ جو اسباب اس وقت تک اللہ کے کلمے کو پست اور جاہلیت کے کلموں کو بلند کرتے رہے ہیں وہ سب بدستور موجود رہیں گے۔ اسی طرح اگر آپ چاہیں کہ موجودہ نظام تو انہی بنیادوں پر قائم رہے مگر اخلاق، یا معاشرت، یا معیشت، یا نظم و نسق، یا سیاست کی موجودہ خرابیوں میں سے کسی کی اصلاح ہو جائے، تو یہ بھی کسی تدبیر سے ممکن نہیں ہے۔ کیونکہ ان میں سے ہر چیز موجودہ نظامِ زندگی کی بنیادی خرابیوں ہی کی آفریدہ اور پروردہ ہے اور ہر خرابی کو دوسری بہت سی خرابیوں سے سہارا مل رہا ہے۔ ایسے حالات میں ایک جامع فساد کو رفع کرنے کے لیے ایک جامع پروگرام ناگزیر ہے جو جڑ سے لے کر شاخوں تک پورے توازن کے ساتھ اصلاح کا عمل جاری کرے۔

وہ پروگرام کیا ہو؟ اور ہمارے نزدیک وہ کیا ہے؟ اسی پر اب میں گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔ مگر اس پر گفتگو شروع کرنے سے پہلے ایک سوال کا جواب ملنا ضروری ہے۔ وہ سوال یہ ہے کہ آپ فی الواقع چاہتے کیا ہیں؟ یا زیادہ صحیح الفاظ میں، آپ میں سے کون کیا چاہتا ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ ہم اب ایک ایسے مرحلے پر پہنچ چکے ہیں جہاں مسلسل تجربے نے یہ بات ثابت کر دی ہے کہ اسلام اور جاہلیت کا یہ ملا جُلا مرکب، جو اب تک ہمارا نظامِ حیات بنا رہا ہے، زیادہ دیر تک نہیں چل سکتا۔ یہ اگر چلتا رہا تو دنیا میں بھی ہماری کامل تباہی کا موجب ہوگا اور آخرت میں بھی۔ اس لیے کہ اس کی وجہ سے ہم اس حالت میں مبتلا ہیں کہ

ایماں مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر

نہ ہم امریکہ اور روس اور انگلستان کی طرح پوری یکسوئی کے ساتھ اپنی دنیا ہی بنا سکتے ہیں، کیونکہ ایمان و اسلام سے ہمارا جو تعلق قائم ہے وہ ہمیں اس راستے پر بے محابا نہیں چلنے دیتا، اور نہ ہم ایک سچی مسلمان قوم کی طرح اپنی آخرت ہی بنا سکتے ہیں، کیونکہ یہ کام ہمیں وہ جاہلیت نہیں کرنے دیتی جس کے بے شمار فتنے ہم نے اپنے اندر پال رکھے ہیں۔ اس دودلی کی وجہ سے ہم کسی چیز کا حق بھی پوری طرح ادا نہیں کر سکتے۔ نہ دنیا پرستی کا، نہ خدا پرستی کا۔ اس کی وجہ سے ہمارا ہر کام خواہ دینی ہو یا دنیوی، دو متضاد افکار اور رجحانات کی رزم گاہ بنا رہتا ہے، جن میں سے ہر ایک دوسرے کا توڑ کرتا ہے اور کسی فکر و رجحان کے مطالبے بھی کماحقہٗ پورے نہیں ہونے پاتے۔ یہ حالت بہت جلدی ختم کر دینے کے لائق ہے۔ اگر ہم اپنے دشمن نہیں ہیں تو ہمیں بہر حال یکسو ہو جانا چاہیے۔

اس یکسوئی کی صرف دو ہی صورتیں ممکن ہیں اور ہم کو دیکھنا ہے کہ ہم میں سے کون کس صورت کو پسند کرتا ہے۔ اس کی ایک صورت یہ ہے کہ ہمارے سابق حکمرانوں نے اور ان کی غالب تہذیب نے جس راستے پر اس ملک کو ڈالا تھا اُسی کو اختیار کر لیا جائے اور پھر خدا اور آخرت اور دین اور دینی تہذیب و اخلاق کا خیال چھوڑ کر ایک خالص مادہ پرستانہ تہذیب کو نشو و نما دیا جائے تاکہ یہ ملک بھی ایک دوسرا روس یا امریکہ بن سکے۔ مگر علاوہ اِس کے کہ یہ راہ غلط ہے، خلافِ حق ہے اور تباہ کن ہے، میں کہوں گا کہ پاکستان میں اِس کا کامیاب ہونا ممکن بھی نہیں ہے، اس لیے کہ یہاں کے نفسیات اور روایات میں اسلام کی محبت اور عقیدت اتنی گہری جڑیں رکھتی ہے کہ انہیں اکھاڑ پھینکنا کسی انسانی طاقت کے بس کا کام نہیں ہے۔ تاہم جو لوگ اس راستے پر جانا چاہتے ہیں، وہ میری اس گفتگو کے مخاطب نہیں ہیں۔ ان کے سامنے ہم اپنا پروگرام نہیں بلکہ جنگ کا الٹی میٹم پیش کرنا چاہتے ہیں۔

یکسوئی کی دوسری صورت یہ ہے کہ ہم اپنی انفرادی اور قومی زندگی کے لیے اُس راہ کو

انتخاب کرلیں جو قرآن اور سنتِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو دکھائی ہے۔ یہی ہم چاہتے ہیں۔ اور یہی ہم سمجھتے ہیں کہ پاکستان کی مسلم آبادی کے کم از کم ۹۹۹ فی ہزار باشندے چاہتے ہیں، اور یہی ہر اس شخص کو چاہنا چاہیے جو خدا اور رسول کو مانتا ہو اور موت کے بعد کی زندگی کا قائل ہو۔ مگر جو لوگ بھی اس راہ کے پسند کرنے والے ہوں، انہیں یہ اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ جن حالات سے ہم گزرتے ہوئے آرہے ہیں اور جن میں اس وقت ہم گھرے ہوئے ہیں، ان میں تنہا اسلام اور خالص اسلام کو پاکستان کا رہنما فلسفۂ حیات اور غالب نظامِ زندگی بنانا کوئی آسان کام نہیں ہے۔

اس کے لیے ضروری ہے کہ ہم اسلام اور غیر اسلامی قدامت کی اُس آمیزش کو جسے صدیوں کی روایات نے پختہ کر رکھا ہے، تحلیل کریں اور قدامت کے اجزاء کو الگ کرکے خالص اسلام کے اُس جوہر کو لے لیں جو قرآن اور سنت کے معیار پر جوہرِ اسلام ثابت ہو۔ ظاہر ہے کہ یہ کام ہمارے اُن گروہوں کی مزاحمت، اور سخت مزاحمت کے بغیر نہیں ہو سکتا جو قدامت کے کسی نہ کسی جزء کے ساتھ گہری وابستگی رکھتے ہیں۔

اس کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ ہم مغرب کی حقیقی تمدنی و علمی ترقیات کو اس کے فلسفۂ حیات اور اندازِ فکر اور اخلاق و معاشرت کی گمراہیوں سے الگ کریں اور پہلی چیز کو لے کر دوسری چیز کو بالکلیہ اپنے ہاں سے خارج کردیں۔ ظاہر ہے کہ اسے ہمارے وہ گروہ برداشت نہیں کر سکتے جنہوں نے خالص مغربیت کو یا اسلام کے کسی نہ کسی مغربی ایڈیشن کو اپنا دین بنا رکھا ہے۔

اِس کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ ایسے لوگ فراہم ہوں اور منظّم طریقے سے کام کریں جو اسلامی ذہنیت کے ساتھ تعمیری صلاحیتیں بھی رکھتے ہوں اور پھر مضبوط سیرت اور صالح اخلاق اور مستحکم ارادے کے مالک بھی ہوں۔ ظاہر ہے کہ یہ جنس ہمارے ہاں ویسے ہی کمیاب ہے، پھر اس دِل گردے کے لوگ آخر کہاں آسانی سے ملا کرتے ہیں جو سیاسی اور معاشی چوٹ بھی سہیں، فتووں کی مار بھی برداشت کریں، اور جھوٹے الزامات کی چوطرفہ بارش کا مقابلہ بھی پورے صبر و سکون کے ساتھ کرتے چلے جائیں۔

ان سب شرطوں کے بعد یہ بھی ضروری ہے کہ اسلام کو نظامِ غالب بنانے کی تحریک اُسی طرح ایک ہمہ گیر سیلاب کے مانند اُٹھے جس طرح مغربی تہذیب یہاں سیلاب کے مانند آئی اور زندگی کے ہر شعبے پر چھا گئی۔ اس ہمہ گیری اور سیلابیت کے بغیر نہ یہ ممکن ہے کہ مغربی تہذیب کو غلبہ و اقتدار سے بے دخل کیا جاسکے، اور نہ یہی ممکن ہے کہ نظامِ تعلیم، نظامِ قانون، نظامِ معیشت اور نظامِ سیاست کو بدل کر ایک دوسرا تمدن خالص اسلامی بنیادوں پر تعمیر کیا جاسکے۔ یہی کچھ ہم چاہتے ہیں۔ ہمارے پیشِ نظر مسلمانوں کی پرانی قومی تہذیب کا احیاء نہیں بلکہ اسلام کا احیاء ہے۔ ہم علومِ جدیدہ اور ان کی پیدا کی ہوئی ترقیات کے مخالف نہیں بلکہ اُس نظامِ تہذیب و تمدن کے باغی ہیں جو مغربی فلسفۂ زندگی اور فلسفۂ اخلاق کا پیدا کردہ ہے۔ ہم دو دو اور چار چار آنے والے ممبر بھرتی کرکے کوئی سیاسی کھیل کھیلنا نہیں چاہتے بلکہ اپنی قوم میں سے چھانٹ چھانٹ کر ایسے لوگوں کو منظم کرنا چاہتے ہیں جو قرآن و سنت کے حقیقی اسلام کو یہاں کا غالب نظامِ زندگی بنانے کے لیے قدامت اور جدت دونوں سے لڑنے پر تیار ہوں۔ ہم زندگی کے کسی ایک جز یا بعض اجزاء میں کچھ اسلامی رنگ پیدا کر دینے کے قائل نہیں ہیں، بلکہ اس بات کے درپے ہیں کہ پورا اسلام پوری زندگی پر حکمراں ہو ــــــ انفرادی سیرتوں اور گھر کی معاشرت پر حکمراں، علوم و فنون اور ادب پر حکمراں، تعلیم کے اداروں پر حکمراں، قانون کی عدالتوں پر حکمراں، سیاست کے ایوانوں پر حکمراں، نظم و نسق کے محکموں پر حکمراں اور معاشی دولت کی پیداوار اور تقسیم پر حکمراں ــــــ اسلام کے اس ہمہ گیر تسلط ہی سے یہ ممکن ہوسکتا ہے کہ پاکستان بیک وقت اُن روحانی، اخلاقی اور مادی فوائد سے پوری طرح متمتع ہو جو رب العالمین کی دی ہوئی ہدایت پر چلنے کا لازمی اور فطری نتیجہ ہیں، اور پھر اسی سے یہ امید کی جاسکتی ہے کہ یہ ملک تمام مسلم ممالک کے لیے دعوت الی الخیر کا اور تمام دنیا کے لیے ہدایت کا مرکز بن جائے۔

ہمارا لائحۂ عمل

ہمارے اس مقصد کو سمجھ لینے کے بعد کسی کو ہمارے لائحۂ عمل کے سمجھنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آسکتی۔ اُس کے چار بڑے بڑے اجزاء ہیں جنہیں میں الگ الگ بیان کروں گا۔

۱- اس کا پہلا جز تطہیرِ افکار و تعمیرِ افکار ہے۔ ہم کئی سال سے اس کوشش میں لگے ہوئے ہیں، اور ہماری اس کوشش کا سلسلہ برابر جاری ہے کہ ایک طرف غیر اسلامی خیالات کے جنگل کو صاف کر کے اصلی اور حقیقی اسلام کی شاہراہِ مستقیم کو نمایاں کیا جائے، دوسری طرف مغربی علوم و فنون اور نظامِ تہذیب و تمدن پر تنقید کر کے بتایا جائے کہ اس میں کیا کچھ غلط اور قابلِ ترک ہے اور کیا کچھ صحیح اور قابلِ اخذ، اور تیسری طرف وضاحت کے ساتھ یہ دکھایا جائے کہ اسلام کے اصولوں کو زمانۂ حال کے مسائل و معاملات پر منطبق کر کے ایک صالح تمدن کی تعمیر کس طرح ہو سکتی ہے اور اس میں ایک ایک شعبۂ زندگی کا نقشہ کیا ہوگا۔ اس طریقے سے ہم خیالات کو بدلنے اور ان کی تبدیلی سے زندگیوں کا رُخ پھیرنے اور ذہنوں کو تعمیرِ نو کے لیے فکری غذا بہم پہنچانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اِس کوشش کے نتائج ہمارے لٹریچر اور ہماری شائع شدہ تقریروں کی شکل میں آپ کے سامنے موجود ہیں۔ ہر شخص انہیں دیکھ کر معلوم کر سکتا ہے کہ ہم کس رُخ پر جا رہے ہیں اور کدھر اپنی قوم کو لے جانا چاہتے ہیں۔

۲- اس کا دوسرا جز صالح افراد کی تلاش، تنظیم اور تربیت ہے۔ ہم ان آبادیوں میں اُن مردوں اور عورتوں کو ڈھونڈ رہے ہیں جو پرانی اور نئی خرابیوں سے پاک ہوں یا اب پاک ہونے کے لیے تیار ہوں، جن کے اندر اصلاح کا جذبہ موجود ہو، جو حق کو حق جان کر اس کے لیے وقت، مال اور محنت کی کچھ قربانی کرنے پر بھی آمادہ ہوں، خواہ وہ نئے تعلیم یافتہ ہوں یا پرانے، خواہ وہ عوام میں سے ہوں یا خواص میں سے، خواہ وہ غریب ہوں یا امیر یا متوسط۔ ایسے لوگ جہاں کہیں بھی ہیں، ہم انہیں گوشۂ عافیت سے نکال کر میدانِ سعی و عمل میں لانا چاہتے ہیں۔ اگر وہ ہمارے مقصد، طریقِ کار اور نظامِ جماعت کو قبول کر لیں تو انہیں اپنی جماعت کا رکن بنا لیتے ہیں، اور اگر وہ رکنیت کی شرائط پوری کیے بغیر صرف تائید اور اتفاق پر اکتفا کریں تو ان کو اپنے حلقۂ متفقین میں شامل ہونے کی دعوت دیتے ہیں۔ اس سے ہمارا مقصد یہ ہے کہ ہمارے معاشرے میں جو ایک صالح عنصر بچا کھچا موجود ہے، مگر منتشر ہونے کی وجہ سے، یا جزوی اصلاح کی پراگندہ کوششیں کرنے کی وجہ سے کوئی

مفید نتیجہ پیدا نہیں کر رہا ہے، اُسے چھانٹ چھانٹ کر ایک مرکز پر جمع کیا جائے اور ایک حکیمانہ پروگرام کے مطابق اس کو اصلاح و تعمیر کی منظم سعی میں لگا یا جائے۔

ہم صرف اس تنظیم ہی پر قناعت نہیں کر رہے ہیں بلکہ ساتھ ساتھ ان منظم ہونے والوں کی ذہنی و اخلاقی تربیت کا بھی انتظام کر رہے ہیں تاکہ ان کی فکر زیادہ سے زیادہ سُلجھی ہوئی، اور ان کی سیرت زیادہ سے زیادہ پاکیزہ، مضبوط اور قابلِ اعتماد ہو۔ ہمارے پیش نظر ابتدا سے یہ حقیقت ہے کہ اسلامی نظام محض کاغذی نقشوں اور زبانی دعووں کے بل پر قائم نہیں ہو سکتا۔ اس کے قیام اور بقاء کا سارا انحصار اس پر ہے کہ آیا اس کی پشت پر تعمیری صلاحیتیں اور صالح انفرادی سیرتیں موجود ہیں یا نہیں۔ کاغذی نقشوں کی خامی تو اللہ کی توفیق سے علم اور تجربہ ہر وقت رفع کر سکتا ہے لیکن صلاحیت اور صالحیت کا فقدان ہو تو سرے سے کوئی عمارت اٹھ ہی نہیں سکتا اور اٹھا بھی دے تو سہار نہیں سکتا۔[۱]

۳- اس کا تیسرا جزء ہے اجتماعی اصلاح کی سعی۔ اس میں سوسائٹی کے ہر طبقے کی اُس کے حالات کے لحاظ سے اصلاح شامل ہے، اور اس کا دائرہ اتنا ہی وسیع ہو سکتا ہے جتنے ہمارے ذرائع وسیع ہوں۔ ہم اپنے ارکان اور کارکن متفقین کو ان کی صلاحیتوں کے لحاظ سے مختلف حلقوں میں تقسیم کرتے ہیں اور ہر ایک کے سپرد وہ کام کرتے ہیں جس کے لیے وہ اہل تر ہو۔ ان میں سے کوئی شہری عوام میں کام کر رہا ہے اور کوئی دیہاتی عوام میں۔ کوئی کسانوں کی طرف متوجہ ہے اور کوئی مزدوروں کی طرف کوئی متوسط طبقے کو خطاب کر رہا ہے اور کوئی اونچے طبقے کو۔ کوئی سرکاری ملازمین کی اصلاح کے لیے کوشاں ہے اور کوئی تجارت پیشہ اور صنعت پیشہ لوگوں کی اصلاح کے لیے۔ کسی کی توجہ پرانی درس گاہوں کی طرف ہے اور کسی کی نئے کالجوں کی طرف۔ کوئی جمود کے قلعوں کو توڑنے میں لگا ہوا ہے اور کوئی الحاد و فسق کے سیلاب کو روکنے میں۔ کوئی شعر و ادب کے میدان میں کام کر رہا ہے اور

---

[۱] جو حضرات ہمارے تنظیم اور تربیت کے پروگرام کو سمجھنا چاہیں وہ ہماری روداد مجلس شوریٰ (اپریل ۱۹۵۱ء) اور ہمارا پمفلٹ "جماعت اسلامی، اس کا مقصد، تاریخ اور لائحۂ عمل" ملاحظہ فرمائیں۔

کوئی علم و تحقیق کے میدان میں۔ یہ سب اگرچہ اپنے الگ حلقہائے کار رکھتے ہیں، مگر سب کے سامنے ایک مقصد اور ایک اسکیم ہے جس کی طرف وہ قوم کے سارے طبقوں کو گھیر کر لانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ان کا متعین نصب العین یہ ہے کہ اس ذہنی، اخلاقی اور عملی انار کی کو ختم کیا جائے جو پرانے جمودی اور نئے انفعالی رجحانات کی وجہ سے ساری قوم میں پھیلی ہوئی ہے، اور عوام سے لے کر خواص تک، سب میں صحیح اسلامی فکر، اسلامی سیرت، اور سچے مسلمانوں کی سی عملی زندگی پیدا کی جائے۔

یہ کام صرف وعظ و تلقین اور نشر و اشاعت اور شخصی ربط و مکالمہ ہی سے نہیں کیا جا رہا ہے بلکہ مختلف سمتوں میں باقاعدہ تعمیری پروگرام بنا کر پیش قدمی کی جا رہی ہے۔ مثلاً ہمارے کارکن جہاں کہیں اپنی تبلیغ سے چند آدمیوں کو متفق بنانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں وہاں وہ انہیں ملا کر ایک حلقۂ متفقین منظم کرتے ہیں اور پھر ان کی مدد سے ایک پروگرام کو عمل میں لانے کی کوشش شروع کر دیتے ہیں جس کے چند اجزاء یہ ہیں :-

بستی کی مسجدوں کی اصلاح حال۔ عام باشندوں کو اسلام کی بنیادی تعلیمات سے روشناس کرانا۔ تعلیم بالغان کا انتظام۔ کم از کم ایک دارالمطالعہ کا قیام۔ لوگوں کو ظلم و ستم سے بچانے کے لیے اجتماعی جدوجہد۔ باشندوں کے تعاون سے صفائی اور حفظان صحت کی کوشش۔ بستی کے یتیموں، بیواؤں، معذوروں اور غریب طالب علموں کی فہرستیں مرتب کرنا اور جن جن طریقوں سے ممکن ہو ان کی مدد کا انتظام کرنا۔ اور اگر ذرائع فراہم ہو جائیں تو کوئی پرائمری اسکول، یا ہائی سکول، یا مذہبی تعلیم کا ایسا مدرسہ قائم کرنا جس میں تعلیم کے ساتھ اخلاقی تربیت کا بھی انتظام ہو۔

اسی طرح ہم مزدوروں کو اشتراکیت کے زہر سے بچانے کے لیے صرف تبلیغ ہی پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ عملاً ان کے مسائل کو حل کرنے کی سعی بھی کرتے ہیں۔ چنانچہ ہم نے مزدوروں اور کارکن طبقوں کی نئی تنظیمات کا سلسلہ شروع کر دیا ہے جن کی بنیاد اسلامی فکر پر رکھی گئی ہے۔ ان تنظیمات کا مقصد انصاف کا قیام ہے نہ کہ ذرائع پیداوار کو قومی ملکیت بنانا۔ ان کا مسلک جائز اور معقول حقوق کے حصول

کی جدوجہد ہے نہ کہ طبقاتی کشمکش۔ ان کا طریق کار اخلاقی اور آئینی ہے نہ کہ توڑ پھوڑ اور تخریب۔ ان کے پیشِ نظر صرف اپنے حقوق ہی نہیں ہیں بلکہ فرائض بھی ہیں اور جو مزدور یا کارکن بھی ان میں شامل ہوتے ہیں ان پر یہ شرط عائد کی جاتی ہے کہ وہ ایمانداری کے ساتھ اپنے حصے کا فرض ضرور ادا کریں گے۔ پھر ان کا دائرۂ عمل صرف اپنے طبقے کے مفاد تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ یہ تنظیمات جس طبقے سے بھی تعلق رکھتی ہیں اس کی دینی، اخلاقی اور معاشرتی حالت کو بھی درست کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔

اس عمومی اصلاح کے پورے لائحۂ عمل کا بنیادی اصول یہ ہے کہ جو شخص جس حلقے اور طبقے میں بھی کام کرے مسلسل اور منظم طریقے سے کرے اور اپنی سعی کو ایک نتیجے تک پہنچائے بغیر نہ چھوڑے۔ ہم اس کے قائل نہیں ہیں کہ ہوا کے پرندوں اور آندھی کے جھکڑوں کی طرح بیج پھینکتے چلے جائیں۔ اس کے برعکس ہم کسان کی طرح کام کرنا چاہتے ہیں جو ایک متعین رقبے کو لیتا ہے، پھر زمین کی تیاری سے لے کر فصل کی کٹائی تک مسلسل کام کرکے اپنی محنتوں کو ایک نتیجے تک پہنچا کر دم لیتا ہے۔ پہلے طریقے سے جنگل پیدا ہوتے ہیں اور دوسرے طریقے سے باقاعدہ کھیتیاں تیار ہو سکتی ہیں۔

۴۔ اس لائحۂ عمل کا چوتھا جز نظامِ حکومت کی اصلاح ہے۔ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ زندگی کے موجودہ بگاڑ کو دور کرنے کی کوئی تدبیر بھی کامیاب نہیں ہو سکتی جب تک کہ اصلاح کی دوسری کوششوں کے ساتھ ساتھ نظامِ حکومت کو درست کرنے کی کوشش بھی نہ کی جائے۔ اس لیے کہ تعلیم اور قانون اور نظم و نسق اور تقسیمِ رزق کی طاقتوں کے بل پر جو بگاڑ اپنے اثرات پھیلا رہا ہو اس کے مقابلہ میں بناؤ اور سنوار کی وہ تدبیریں جو صرف وعظ اور تلقین اور تبلیغ کے ذرائع پر منحصر ہوں، کبھی کارگر نہیں ہو سکتیں۔ لہٰذا اگر ہم فی الواقع اپنے ملک کے نظامِ زندگی کو فسق و ضلالت کی راہ سے ہٹا کر دینِ حق کی صراطِ مستقیم پر چلانا چاہتے ہیں تو ہمارے لیے ناگزیر ہے کہ بگاڑ کو مسندِ اقتدار سے ہٹانے اور بناؤ کو اس کی جگہ متمکن کرنے کی براہِ راست کوشش کریں۔ ظاہر ہے کہ اگر اہلِ خیر و صلاح کے ہاتھ میں اقتدار ہو تو وہ تعلیم اور قانون اور نظم و نسق کی پالیسی کو تبدیل کرکے چند سال کے اندر وہ کچھ کر ڈالیں گے جو غیر سیاسی تدبیروں سے ایک صدی میں بھی نہیں ہو سکتا۔

یہ تبدیلی کس طرح ہو سکتی ہے ؟ ایک جمہوری نظام میں اس کا راستہ صرف ایک ہے، اور وہ ہے انتخابی جدوجہد۔ رائے عام کی تربیت کی جائے، عوام الناس کے معیارِ انتخاب کو بدلا جائے، انتخاب کے طریقوں کی اصلاح کی جائے، اور پھر ایسے صالح لوگوں کو اقتدار کے مقام پر پہنچایا جائے جو ملک کے نظام کو خالص اسلام کی بنیادوں پر تعمیر کرنے کا ارادہ بھی رکھتے ہوں اور قابلیت بھی۔ خوش قسمتی سے قراردادِ مقاصد نے ہمارے راستے سے وہ دستوری رکاوٹیں دور کر دی ہیں جو ہمارے لیے اب تک اس طریقے کو اختیار کرنے میں سدِّ راہ بنی ہوئی تھیں۔ ان رکاوٹوں کے دور ہوتے ہی اب ہم نے انتخابات میں حصہ لینا شروع کر دیا ہے اور اس کام میں وہی مقصد ہمارے پیشِ نظر ہے جو میں نے ابھی آپ سے بیان کیا ہے۔

ہماری تشخیص یہ ہے کہ اس ملک کے سیاسی نظام کی خرابیوں کا بنیادی سبب یہاں کے طریقِ انتخاب کی خرابی ہے۔ جب انتخاب کا موسم آتا ہے تو منصب و جاہ کے خواہشمند لوگ اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور دوڑ دھوپ کر کے یا تو کسی پارٹی کا ٹکٹ حاصل کرتے ہیں یا آزاد امیدوار کی حیثیت سے اپنے لیے کوشش شروع کر دیتے ہیں۔ اس کوشش میں وہ کسی اخلاق اور کسی ضابطے کے پابند نہیں ہوتے۔ کسی جھوٹ، کسی فریب، کسی چال، کسی دباؤ، اور کسی ناجائز سے ناجائز ہتھکنڈے کے استعمال میں بھی ان کو دریغ نہیں ہوتا۔ جسے لالچ دیا جا سکتا ہے اس کا ووٹ لالچ سے خریدتے ہیں۔ جسے دھمکی سے مرعوب کیا جا سکتا ہے، اسے مرعوب کر کے ووٹ حاصل کرتے ہیں۔ جسے دھوکا دیا جا سکتا ہے اس کا ووٹ دھوکے سے لیتے ہیں۔ اور جس کے کسی تعصب سے اپیل کرنا ممکن ہوتا ہے اس کا ووٹ تعصب کے نام پر مانگتے ہیں۔ اس گندے کھیل کے میدان میں قوم کے شریف عناصر اول تو اترتے ہی نہیں، اور بھولے بھٹکے اگر وہ کبھی اتر بھی آتے ہیں تو پہلے ہی قدم پر انہیں میدان چھوڑ دینا پڑتا ہے۔ مقابلہ صرف ان لوگوں کے درمیان رہ جاتا ہے جنہیں نہ خدا کا خوف ہو، نہ خلق کی شرم، اور نہ کوئی بازی کھیل جانے میں کسی طرح کا باک۔ پھر ان میں سے کامیاب ہو کر وہ نکلتا ہے جو سب جھوٹوں کو جھوٹ میں اور سب چال بازوں کو چال بازی میں شکست دے دے۔ رائے دینے

والی پبلک جس کے ووٹوں سے یہ لوگ کامیاب ہوتے ہیں۔ نہ اصولوں کو جانچتی ہے، نہ پروگراموں کو پرکھتی ہے، نہ سیرتوں اور صلاحیتوں کو دیکھتی ہے۔ اُس سے جو بھی زیادہ ووٹ جھپٹ لے جائے وہ بازی جیت لیتا ہے۔ بلکہ اب تو اس کے حقیقی ووٹوں کی اکثریت بھی کوئی چیز نہیں رہی ہے۔ کرائے پروووٹ دینے والے جعلی ووٹر، اور بد دیانت پولنگ افسر اپنے ہاتھوں کے کرتب سے بارہا اُن لوگوں کو شکست دے دیتے ہیں جن کو اصلی رائے دہندوں کی اکثریت کا اعتماد حاصل ہوتا ہے۔ اور بسا اوقات انتخاب کی نوبت بھی نہیں آنے پاتی۔ ایک بے ضمیر مجسٹریٹ اوپر کا اشارہ پاکر تمام امیدواروں کو بیک جنبشِ قلم میدان سے ہٹا دیتا ہے، اور منظورِ نظر آدمی بلا مقابلہ پورے حلقۂ انتخاب کا نمائندہ بن جاتا ہے خواہ وہ واقعی نمائندہ ہو یا نہ ہو۔

ہر شخص جو کچھ بھی عقل رکھتا ہے، ان حالات کو دیکھ کر خود یہ اندازہ کر سکتا ہے کہ جب تک یہ طریقِ انتخاب جاری ہے، کبھی قوم کے شریف اور نیک اور ایماندار آدمیوں کے ابھرنے کا امکان ہی نہیں ہے۔ اس طریقے کا تو مزاج ہی ایسا ہے کہ قوم کے بدتر سے بدتر عناصر چھٹ کر سطح پر آئیں اور جس بداخلاقی و بدکرداری سے وہ انتخاب جیتتے ہیں اُسی کی بنیاد پر وہ ملک کا انتظام چلائیں۔

ہم چاہتے ہیں کہ اس طریقے کو بدلا جائے اور اس کی جگہ ایک بہتر طریقے کو رواج دیا جائے۔ ہم نے جو طریقہ پنجاب میں اختیار کیا، اور جسے اب صوبہ سرحد میں آزما رہے ہیں[1] اور سندھ و بہاولپور میں آزمانا چاہتے ہیں، اس کی تشریح میں آپ کے سامنے کرتا ہوں، آپ خود دیکھ لیں کہ یہ طریقہ پہلے طریقے سے بہتر ہے یا نہیں، اور اس سے نظامِ حکومت کی اصلاح کی توقع کی جا سکتی ہے یا نہیں۔

ہمارا طریقہ یہ ہے کہ جس علاقے میں انتخابات کے انعقاد کا اعلان ہو اس میں ہمارے کارکن جگہ جگہ جا کر تحریر اور تقریر کے ذریعہ سے عوام کے سامنے حکومت کے اسلامی اصول، اور ان اصولوں پر نظامِ حکومت کا تفصیلی نقشہ پیش کرتے ہیں، اور لوگوں کو بتاتے ہیں کہ اس پروگرام کو نافذ کرنے کے لیے

---

[1] واضح رہے کہ اس تقریر کے وقت صوبہ سرحد میں انتخابی جدوجہد ہو رہی تھی۔

ان اخلاقی صفات اور ان ذہنی صلاحیتوں کے آدمی درکار ہیں جنہیں چننا اور اپنے روپے اور دوڑ دھوپ سے کامیاب کرانا آپ کا اپنا کام ہے۔ آپ کسی امیدوار کو ووٹ نہ دیں، خواہ وہ آزاد ہو یا کسی پارٹی سے ٹکٹ لے کر آیا ہو۔ آپ اگر نظامِ حکومت کو ان اصولوں پر صحیح طریقے سے چلوانا چاہتے ہیں تو خود سر جوڑ کر بیٹھیے اور اپنے اندر سے ایسے لوگ تلاش کیجیے جن کی دینی اور اخلاقی حالت اور علمی قابلیت پر آپ کو بھروسہ ہو۔ اس طرح کے جو لوگ آپ کی نگاہ میں ہوں ان کو اپنی طرف سے نمائندہ بنا کر اٹھائیے، ان کی انتخابی مہم پر اپنا روپیہ خرچ کیجیے اور ان کے حق میں رائے عام کو ہموار کرنے کے لیے خود ہی کوشش کیجیے، تاکہ وہ بے غرض ہو کر اپنے نفس کے لیے نہیں بلکہ آپ کی بہتری کے لیے کام کریں۔ اس طریق کار اور اس پروگرام سے جو لوگ اتفاق کرتے ہیں ان سے ہم ایک عہد لیتے ہیں اور انہیں حلقہ ہائے متفقین (یا بالفاظ دیگر پنچایتوں) کی شکل میں منظم کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ پھر جن جن انتخابی حلقوں میں کافی پنچایتیں منظم ہو جاتی ہیں ان میں ہم انہی متفقین کو جمع کر کے ان سے درخواست کرتے ہیں کہ آپ اپنے علاقے میں مطلوبہ صفات کے آدمی تلاش کریں اور ان میں سے کسی ایک کو بالاتفاق یا اکثریت کے ساتھ اپنا نمائندہ چن لیں۔ پنچایت کے اجتماع سے پہلے اس کے ہر شریک سے عہد لیا جاتا ہے کہ وہ نمائندہ چننے میں کسی تعصب یا ذاتی مفاد کا لحاظ نہ کریگا بلکہ خدا سے ڈرتے ہوئے ایمانداری کے ساتھ اپنی رائے دیگا۔ اس طرح جو شخص پورے علاقے کی پنچایتوں کی طرف سے چنا جاتا ہے اس کی پرائیویٹ اور پبلک زندگی کی اچھی طرح جانچ کی جاتی ہے۔ اگر اس میں کوئی خرابی ہوتی ہے تو مرکزی پنچایت سے نظرثانی کی درخواست کی جاتی ہے، ورنہ قابل اطمینان ہونے کی صورت میں جماعت اسلامی اس کو جائز نمائندہ تسلیم کر کے اس کی کامیابی کے لیے سعی کرنے کا ذمہ لیتی ہے۔ کاغذات نامزدگی داخل کرنے سے پہلے مجمع عام میں اس تجویز کردہ نمائندے سے عہد لیا جاتا ہے کہ وہ پنچایت کے منظور کیے ہوئے منشور کا پابند رہیگا، اسمبلی میں پہنچ کر ان لوگوں کے ساتھ مل کر کام کریگا جو اسی منشور کو عملی جامہ پہنانے کے لیے اسی طریقہ پر کامیاب ہو کر وہاں پہنچیں، اور جب کبھی پنچایت اس پر اظہار بے اعتمادی کرے،

وہ مستغنی ہو کر واپس آجائے گا۔[1] اس کے بعد اس نمائندے کے حق میں رائے عام کو ہموار کرنے اور اس کو انتخاب میں کامیاب کرانے کی جدوجہد شروع کر دی جاتی ہے، اور اس جدوجہد میں حصہ لینے والے تمام کارکنوں پر، خواہ وہ جماعت کے ارکان ہوں یا پنچایتوں کے کارکن، یہ لازم کیا جاتا ہے کہ وہ اخلاق کے حدود اور انتخابی ضوابط کی پوری پابندی کریں گے، کسی تعصب کے نام پر اپیل نہ کریں گے، کسی کے جواب میں بھی جھوٹ اور بہتان تراشی اور چال بازیوں سے کام نہ لیں گے کسی کی رائے روپے سے خریدنے یا دباؤ سے حاصل کرنے کی کوشش نہ کرینگے، کوئی جعلی ووٹ نہ بھگتائیں گے، اور خواہ جیتیں یا ہاریں، بہرحال شروع سے آخر تک پوری انتخابی جنگ صداقت اور دیانت کے ساتھ بالکل بااصول طریقے سے لڑیں گے۔

یہ جمہوریت کی تاریخ میں پہلا انتخابی تجربہ ہے جس کی ابتدا ہم نے پنجاب سے کی۔ اس کا حاصل آپ کے سامنے جس شکل میں آیا ہے وہ تو صرف یہ ہے کہ پنجاب اسمبلی میں صرف ایک آدمی اس راستے سے پہنچا۔ اس بنا پر ممکن ہے کہ آپ اسے ایک ناکام تجربہ قرار دیں۔ مگر ہم نے پہلے ہی قدم پر اس تجربے سے جو حقیقی نتائج حاصل کیے ہیں وہ ایسے ہیں کہ اگر ایک نشست پر بھی ہمیں کامیابی نہ ہوتی تب بھی ہم اپنے آپ کو کامیاب ہی سمجھتے۔ ہم نے پہلی مرتبہ اپنے ملک کی پبلک کو ایک ایسی انتخابی جدوجہد سے روشناس کرایا جو خالص اخلاقی طریقوں سے اصول اور پروگرام کی بنیاد پر کی گئی۔ پہلی مرتبہ شہروں اور دیہات کے عوام تک براہ راست پہنچ کر انہیں اسلامی حکومت کے اصولی اور تفصیلی خدوخال سے آشنا کیا اور انہیں بتایا کہ اس طرز حکومت کو چلانے کے لیے کیسے آدمی موزوں ہوتے ہیں۔ پہلی مرتبہ عوام الناس میں یہ احساس پیدا کیا کہ اپنے ملک کے مسائل و معاملات کا براہ راست خود ان سے تعلق ہے اور انہی کی یہ ذمہ داری ہے کہ حکومت کا انتظام چلانے کے لیے موزوں آدمی چنیں۔ پہلی مرتبہ اس ذمہ داری کو ادا کرنے کے لیے ان کے سامنے ایک طریقہ رکھا اور ان کو منظم کر کے خود ان کے ہاتھوں سے وہ مشینری بنوائی جس سے

---

[1] اس طریقہ اور پروگرام کی مکمل تشریح کے لیے ملاحظہ ہو "جماعت اسلامی کی انتخابی جدوجہد" اور "منشور جماعت اسلامی"۔

وہ آپ ہی اپنے لیے موزوں آدمی نامزد کر سکیں۔ اس جدوجہد کے سلسلہ میں صرف چھ مہینے کے اندر ہم نے کم و بیش ۲۵ لاکھ آدمیوں تک پہنچ کر انہیں اپنی بات سمجھائی۔ ۴۰۰ کے قریب بستیوں میں پنچایتیں بنائیں۔ ۳۷ انتخابی حلقوں میں دو ہزار سے زیادہ پنچوں نے بیٹھ کر ۳ دنمائندے نامزد کیے جن کے کیرکٹر پر مخالفین بھی حرف نہ رکھ سکے۔ چار ہزار کے قریب کارکنوں نے خالص بے غرضی کے ساتھ، زیادہ تر خود اپنی جیب سے خرچ کر کے اور اپنے ذاتی کاروبار کا نقصان گوارا کر کے شب و روز کی محنت سے انتخاب کا کام کیا اور پولنگ کے انتہائی بحرانی زمانے میں بھی حدودِ اخلاق اور ضابطہ و قانون کی پابندی کا پورا پورا ثبوت دیا۔ خواتین نے پردے کی پوری پابندیوں کے ساتھ انتخاب کے میدان میں آ کر کام کیا اور پہلی مرتبہ اپنے عمل سے ثابت کر دیا کہ اسلامی حدود کے اندر رہتے ہوئے بھی یہ کام کیا جا سکتا ہے۔ اور اس طرح ہم نے پنجاب کے ۳۷ حلقوں میں ۴ لاکھ سے زیادہ ووٹ حاصل کیے جو کسی دھن، دھونس، دھوکے یا دھاندلی کا نتیجہ نہ تھے بلکہ ہر طرح کے لالچ اور دباؤ کے مقابلہ میں اصول کی خاطر دیئے گئے تھے۔

ان نتائج کو دیکھ کر ہمیں اطمینان ہو گیا ہے کہ ہم اس طریقے سے مسلسل کام کر کے اپنے ملک کی پبلک کو بتدریج چند سال کے اندر کافی تربیت دے سکیں گے اور ہر نئے انتخاب کے موقع پر خود بخود پیمائش ہوتی چلی جائے گی کہ اس تربیت کے اثرات کو پبلک نے کس حد تک قبول کیا۔ ہو سکتا ہے کہ نظامِ حکومت کی واقعی تبدیلی میں ۲۵ سال صرف ہو جائیں، یا اس سے بھی زیادہ۔ مگر ہم سمجھتے ہیں کہ تبدیلی کا صحیح راستہ یہی ہے اور جو تبدیلی اس طریقے سے ہو گی وہ انشاء اللہ پائیدار و مستحکم ہو گی۔

حرفِ آخر

حضرات! میں نے اپنی ان دونوں تقریروں میں مرض اور اسبابِ مرض کی پوری تشخیص و تشریح بھی آپ کے سامنے رکھ دی ہے، طریقِ علاج بھی بیان کر دیا ہے، اور وہ مقصد بھی پیش کر دیا ہے جس کے لیے ہم علاج کی یہ کوششیں کر رہے ہیں۔ اب یہ فیصلہ کرنا آپ میں سے ہر شخص کا اپنا کام

ہے کہ آیا اسے ہمارا ساتھ دینا چاہیے، یا تماشا دیکھنا چاہیے، یا مزاحمت کرنی چاہیے۔ بہرحال جو شخص جو فیصلہ بھی کرے، ساتھ کے ساتھ اپنا وہ جواب بھی سوچ لے جو اللہ تعالیٰ کے حضور اس کو دینا ہے۔ ہم نے پوری بصیرت کے ساتھ اپنے لیے ایک مقصد زندگی اور ایک طریق عمل طے کر لیا ہے اور اس پر ہمیں بہرحال کام کرنا ہے، خواہ کوئی ساتھ دے، یا تماشا دیکھے، یا مزاحمت کرے۔ ہمارے کام میں کوئی نقص ہو اور وہ دلیل و حجت سے ہمیں سمجھا دیا جائے تو ہم شکریے کے ساتھ اسے قبول کریں گے اور اپنی اصلاح کریں گے۔ الحمد للہ کہ اپنے بے خطا ہونے کا غرہ ہمیں نہیں ہے۔ لیکن اگر کوئی یہ سمجھتا ہو کہ وہ جھوٹ کے طوفان اٹھا کر، یا فتووں کی مشین گن چلا کر، یا سیاسی طاقت استعمال کر کے ہمارا راستہ روک سکیگا، تو میں اللہ کی مدد کے بھروسے پر یہاں صاف صاف کہے دیتا ہوں کہ یہ حرکتیں آخر کار خود اسی کو رسوا کر کے چھوڑیں گی۔ انشاء اللہ ہمارا بال بھی بیکا نہ ہو سکے گا۔

آخر میں، میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ جو کچھ میں نے اپنی ان تقریروں میں کہا ہے، اگر وہ حق ہے تو اس کے لیے اپنے بندوں کے دل کھول دے اور انہیں اس کا ساتھ دینے کی توفیق بخشے، اور اگر وہ باطل ہے تو مجھے بھی اس سے بچائے اور اپنے بندوں کو بھی اس سے محفوظ رکھے۔ وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

ہم اس مُلک میں کیا تغیّرات چاہتے ہیں

مولانا امِین احسن اِصلاحی

[یہ وہ تقریر ہے جو مولانا نے ۱۱ نومبر ۱۹۵۱ء کو جماعت اسلامی کے اجتماع عام منعقدہ کراچی میں ارشاد فرمائی]:

خطبہ مسنونہ کے بعد ــــــــ

حاضرین اور خواتین۔ شائع شدہ پروگرام سے آپ کو اس بات کا علم ہو چکا ہوگا کہ مجھے اس وقت آپ کو یہ بتانا ہے کہ ہم اس ملک میں کیا تغیرات چاہتے ہیں۔

اگر آپ اس سوال کا جواب مجھ سے دو لفظوں میں چاہیں تو میں اس کا یہ جواب دے سکتا ہوں کہ ہم اس ملک کی زندگی کے ہر شعبہ میں پورے اسلام کو لانا چاہتے ہیں۔ یہ چیز، جیسا کہ آپ حضرات کو اچھی طرح علم ہوگا، صرف ہمارے ہی پیش نظر نہیں ہے بلکہ جہاں تک اقرار و اظہار اور ادعا و اعلان کا تعلق ہے پاکستان کے تخیل کی ابتداء سے لے کر آج تک شاید ہی کوئی ایسی جماعت اٹھی ہو جس نے اپنا نتہا اس مقصد کو نہ بتایا ہو۔ اس مملکت کے تخیل کو ایک مقدس تخیل جس چیز نے بنایا وہ ہمارے لیڈروں کا یہ بار بار کہنا ہی تھا کہ ہمیں ایک آزاد خطۂ زمین کی ضرورت ہے جہاں ہم اپنی قوم کو اسلام کے اصولوں، اسلام کے عقائد، اور اسلام کے سکھائے اور بتلائے ہوئے اخلاق و اعمال کے مطابق آزادانہ تربیت دے سکیں۔ پھر جب اس مملکت کو تائیدِ ایزدی نے قائم کرا دیا تو اس کے بعد بھی ہمارے لیڈر حضرات عموماً یہی بات دُہراتے رہے ہیں۔ اس ملک کے عوام کی زبانوں پر بھی یہی چیز رہی ہے اور اس ملک کے خواص بھی اس بات کو کہتے رہے ہیں۔ ہمارے نئے تعلیم یافتہ لوگ بھی یہی نعرہ لگاتے رہے ہیں اور ہمارے علما بھی اسی بات کا وعظ کرتے رہے ہیں۔ ادھر پچھلے چند سالوں کے اندر ہماری قوم کے مختلف طبقات

کی طرف سے جو بات سب سے زیادہ دہرائی گئی ہے اور مختلف اسلوبوں اور طریقوں سے دہرائی گئی ہے وہ یہی ہے کہ ہم اس ملک میں اسلامی نظامِ حیات لانا چاہتے ہیں۔ اور اس کی زندگی کے ہر گوشے میں وہی اصول و نظریات کارفرما دیکھنا چاہتے ہیں جن کی تعلیم اسلام نے ہم کو دی ہے۔

ایک ایسی عام حکایت اور ایسی مشہور داستان، جو اس طرح افسانۂ بزم و انجمن ہو، جس کو ہر شخص نے سنا ہو اور جس کو سب دُہرا بھی رہے ہوں، آپ حیران ہونگے کہ اسی کو اس موقع پر پھر دُہرانے کی کیا ضرورت ہے؟ اگر یہی بات سب کہہ رہے ہیں اور اس ملک کے اربابِ کار کو اور اس ملک کی نمایاں پارٹیوں کو اس سے پورا پورا اتفاق ہے تو پھر یہ بات بار بار کیوں کہی جائے؟ کیوں نہ صبر کے ساتھ حالات کا انتظار کیا جائے اور کام کرنے والوں کو کام کرنے کا موقع دیا جائے؟ یہ سوال آپ کے ذہنوں میں پیدا ہوتا ہوگا۔ اس لیے میں سب سے پہلے اسی سوال کا جواب دینے کی کوشش کروں گا۔

اس مسئلہ پر بار بار بحث کرنے کی ضرورت ہمیں جن اسباب سے پیش آتی ہے وہ تین ہیں:-

اس کا سب سے پہلا اور سب سے بڑا سبب تو ہماری قوم کی جہالت ہے۔ ہماری قوم اسلام سے محبت تو رکھتی ہے اور فی الواقع اس کی خواہش اور تمنا بھی یہی ہے کہ اس ملک میں اسلامی نظامِ حیات آئے۔ لیکن وہ جانتی نہیں کہ اسلام ہے کیا چیز؟ اس وجہ سے جو چیز بھی اسلام کے نام سے پیش کر دی جاتی ہے وہ بڑی آسانی سے اسی کو اسلام سمجھ بیٹھتی ہے۔ ہماری قوم کی اس کمزوری سے اس ملک کے لیڈروں نے بڑا فائدہ اٹھانے کی کوشش کی ہے اور اس کوشش میں انہیں بہت بڑی حد تک کامیابی بھی ہوئی ہے۔ انہوں نے جس چیز کو بھی قوم میں مقبول بنانا چاہا ہے، خواہ اسے اسلام سے دُور کا بھی کوئی واسطہ نہ ہو، اس پر اسلام کا لیبل لگا کر اس کو قوم کے سامنے رکھ دیا ہے اور تھوڑے دنوں کے پروپگنڈے کے بعد وہ خالص جاہلی چیز اسلامی بن گئی ہے۔ قوم کی اس بے خبری کی وجہ سے اس بات کی بڑی شدید ضرورت ہے کہ ہم اس کو یہ بتاتے رہیں کہ جس اسلام کو وہ چاہتی ہے وہ فی الحقیقت ہے کیا؟ اور جس اسلامی نظامِ حیات کی وہ تمنا رکھتی ہے جب وہ کسی سرزمین پر قائم ہوگا تو اس کے نمایاں خط و خال کیا ہونگے اور کن کن پہلوؤں سے وہ دنیا کے سارے نظاموں سے ایک بالکل نمایاں اور

ممتاز چیز ہوگا، اور اس سرزمین کے باشندوں کے لیے اپنے ساتھ کیا کیا آسمانی برکتیں لائیگا؛ اگر ہماری یہ کوشش برابر جاری نہ رہی تو ہمیں جس قسم کے بے خبروں اور جس ٹائپ کے ہوشیاروں سے سابقہ ہے اس کی بنا پر ہمیں اندیشہ ہے کہ قوم کے سامنے سونے کے نام سے پیتل رکھ دیا جائے گا اور وہ اسی کو سونا سمجھ لے گی۔

دوسری چیز جس کے سبب سے اس کی بار بار وضاحت کرنی پڑتی ہے وہ ہماری قوم کے لیڈروں کی نہایت کھلی ہوئی منافقت ہے۔ اب یہ حقیقت محتاج ثبوت نہیں رہی ہے کہ جو لوگ ہماری قوم کی قیادت فرما رہے ہیں وہ منافقت کی بیماری میں مبتلا ہیں۔ وہ جن چیزوں کا قوم سے بار بار اس شدومد کے ساتھ وعدہ کر رہے ہیں تمام قرائن و شواہد اس بات کا ثبوت بہم پہنچا رہے ہیں کہ وہ ان چیزوں میں سے ایک چیز کو بھی بروئے کار لانا نہیں چاہتے۔ وہ بار بار جمہوریت کا نام لیتے ہیں۔ لیکن انہوں نے اپنے دور اقتدار میں جمہوریت کی آبرو مٹا کے رکھ دی ہے۔ وہ بار بار اسلام کا نام لیتے ہیں۔ لیکن ان کا ہر قدم جو اٹھتا ہے وہ کھلم کھلا اسلام کے خلاف اٹھتا ہے۔ وہ اپنی تقریروں میں رسول اللہ صلعم کا نام نامی دہراتے ہوئے نہیں تھکتے۔ لیکن انہوں نے رسول اللہ صلعم کی سنت کے مٹانے میں عملاً اور قولاً جو جسارت دکھائی ہے اس کی مثال مشکل ہی سے کہیں اور مل سکے گی۔ وہ قرآن کا نام بار بار لیتے ہیں۔ لیکن نہ وہ قرآن کی کسی بات سے واقف ہیں اور نہ اس کی کسی بات سے واقف ہونے یا اس پر عمل کرنے کے خواہشمند ہیں۔ نہ وہ اپنی انفرادی زندگیوں میں اس اسلام کا کوئی ثبوت دیتے ہیں جس اسلام کے ذکر سے ان کی تقریریں معمور رہتی ہیں اور نہ اپنی سیاسی و اجتماعی زندگی میں اب تک انہوں نے کوئی ایسا قدم اٹھایا ہے جس کو اسلامی قدم سے تعبیر کیا جا سکے۔

میں ان کی انفرادی زندگیوں سے غضِ بصر کیے لیتا ہوں ــــ میں نے "غضِ بصر" کا لفظ بالقصد استعمال کیا ہے اس لیے کہ ان کی انفرادی زندگیاں اپنے اندر اتنی مکروہ بات رکھتی ہیں کہ ایک شریف اور معقول آدمی کو ان سے غضِ بصر ہی کرنا پڑتا ہے ــ البتہ مجھے ان کی اجتماعی زندگی سے بحث

کرنے کا پورا پورا حق ہے اور مجھے نہایت افسوس کے ساتھ یہ کہنا پڑتا ہے کہ آج تک انہوں نے اپنی اجتماعی و سیاسی زندگی کے میدان میں جتنے کارنامے بھی انجام دیے ہیں اُن میں قرار دادِ مقاصد کے سوا ایک چیز بھی ایسی نہیں ہے جس کے اندر اسلام کا کوئی ادنیٰ شائبہ بھی پایا جاتا ہو۔ انہوں نے جو چیز بھی پیش کی ہے وہ خالص جاہلی پیش کی ہے۔ انہوں نے جتنے قدم بھی اٹھائے ہیں سب غیر اسلام کی راہ میں اُٹھائے ہیں۔ اور جتنے کام بھی کیے ہیں وہ سب ایسے ہیں جو اسلام میں مطلوب نہیں بلکہ نامطلوب تھے۔ اسلام کے دعوے کے ساتھ ساتھ اسلام کی ایسی کھلی خلاف ورزیاں دیکھ کر ہم مجبور ہوتے ہیں کہ قوم کو بار بار یہ سمجھاتے رہیں کہ جس اسلام کو وہ چاہتی ہے وہ اسلام اِن لیڈروں کے اسلام سے بالکل مختلف چیز ہے اور اس کو عملاً اس ملک میں لانے کے لیے اِن لیڈروں پر اعتماد کرنا یقیناً انتہائی نادانی ہوگی۔ اگر اس کو فی الواقع لانا ہے تو اس کے لیے پورے شعور کے ساتھ جدوجہد کرنی پڑے گی بلکہ عجب نہیں کہ اس راہ میں قربانیاں بھی دینی پڑیں۔ یہ کام بظاہر اس آسانی کے ساتھ ہوتا نظر نہیں آتا جس آسانی کے ساتھ اس کے ہونے کی بہت سے لوگ توقع کیے بیٹھے ہیں۔

ایک تیسرا سبب جو اس حقیقت کو بار بار دُہرانے اور واضح کرنے پر ہمیں مجبور کرتا ہے وہ ہماری قوم کے اندر ایک ایسے طبقہ کا پایا جانا ہے جو بدقسمتی سے جہالت اور منافقت کے ساتھ ساتھ شرارت کے روگ میں بھی مبتلا ہے۔ ممکن ہے آپ اس لفظ کے اندر کچھ سختی اور کڑواہٹ محسوس کرتے ہوں، لیکن اسلام کے ساتھ، اسلامی تعلیمات و عقائد کے ساتھ، اسلامی نظامِ حیات کے ساتھ، اسلامی افکار و نظریات کے ساتھ، قرآنی اصولِ حیات کے ساتھ، اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اُسوۂ حسنہ کے ساتھ ان لوگوں کا جو رویہ ہے وہ کھلم کھلا معاندانہ ہے، اس لیے میں مجبور ہوں کہ ان کے اس رویہ کو شرارت کے لفظ سے تعبیر کروں۔ یہ لوگ اگرچہ مسلمانوں کے اندر شامل سمجھے جاتے ہیں اور ان کی خود بھی خواہش اور کوشش یہی ہے کہ وہ مسلمانوں کے اندر شامل رہیں، لیکن یہ اسلام کی نہایت واضح تعلیمات کا مذاق اڑاتے ہیں۔ اسلامی احکام پر پھبتیاں کستے اور فقرے چست کرتے ہیں۔ اسلامی نظام کے خلاف عوام کو بدگمان کرنے کے لیے طرح طرح کی باتیں کستے

ہیں۔ کبھی اسلام کو ملّا ازم کے نام سے پکارتے ہیں۔ کبھی اسلام کو دقیانوسیت سے تعبیر کرتے ہیں۔ کبھی کہتے ہیں کہ اس ملک میں اسلام کے لانے کے معنی اس ملک میں جاگیردارانہ نظام کے احیاء کے ہیں۔ کبھی کہتے ہیں کہ اگر اسلامی نظام آیا تو نخاسوں پر اس طرح لونڈیاں اور غلام بکیں گے جس طرح کبھی بکتے رہے ہیں۔ کبھی کہتے ہیں کہ اگر اس ملک میں اسلام کا قانون جاری ہوا تو نہ کسی کا سر سلامت رہے گا نہ کسی کے ہاتھ پہنچے سلامت رہیں گے اور نہ کسی کا تن بدن سلامت رہیگا۔ معمولی باتوں پر لوگوں کے سر قلم کر دیے جائیں گے۔ ہاتھ کاٹ ڈالے جائیں گے۔ اور سنگسار کر کے جسموں کے پرخچے اڑا دیئے جائیں گے۔ اسی طرح وہ کہتے ہیں کہ قرآن مجید جو چودہ سو سال پہلے کے مسائل کو حل کرنے کے لیے آیا تھا اب وہ چودہ سو سال بعد کے مسائل کے حل کرنے کے قابل نہیں رہا۔ اب دنیا کہاں سے کہاں نکل چکی ہے اور ملّا ابھی تک اپنی ہی رٹ لگائے چلا جا رہا ہے۔ وہ ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر اسلامی تاریخ سے ایسی چیزیں نکال رہے ہیں جن کی مدد سے اسلامی تاریخ کے اصلی خط و خال کو مٹایا جا سکے۔ ان کے نزدیک ہماری تاریخ کی سب سے زیادہ نمایاں چیزیں وہ چند لغزشیں ہیں جو کسی شخص سے پچھلے زمانہ میں صادر ہو گئی ہوں۔ اگر اس طرح کی کچھ لغزشیں ان کو ہاتھ آجاتی ہیں تو اُن کو وہ خاص اہتمام سے نمایاں کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ اسلام تو یہی کچھ سکھانے کے لیے آیا تھا۔ یہودیوں نے جس طرح انبیاء علیہم السلام کے متعلق تہمتیں تراشی تھیں، اُسی طرح یہ لوگ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ رضی اللہ عنہم کے متعلق تہمتیں تراشتے ہیں۔ ہماری تاریخ کے پچھلے دور میں اگر اسلامی اصولوں کی کچھ غلط تعبیریں کسی نے کی ہیں تو اُن کو نئے آب و رنگ کے ساتھ اس طرح پیش کیا جا رہا ہے گویا اسلام کی حقیقی تعبیریں یہی ہیں۔ بسا اوقات بعض باتیں نہایت غلط طور پر بعض بزرگوں کی طرف منسوب کر دی جاتی ہیں اور پھر ان کی ثقاہت و بزرگی کا حوالہ دیکر اُن کو مسلمانوں کے سامنے اس لیے پیش کیا جاتا ہے کہ عوام کے اندر غلط فہمیاں پھیلائی جائیں۔ حالانکہ اُن بزرگوں کے ذہنوں میں اُن باتوں کا کبھی خطرہ بھی نہیں گذرا ہوگا۔

یہ تین سبب ہیں جن کی وجہ سے ایک ہی داستان ہمیں بار بار مختلف اسلوبوں سے دہرانی

اور ایک ہی کتھا بار بار سنانی پڑتی ہے۔ اس کے لیے ہمیں وسیع لٹریچر شائع کرنا پڑا ہے اور انہی خطرات سے اپنی قوم کو بچانے کے لیے ہمیں اُن مسائل کو بھی دلائل و براہین سے ثابت کرنا پڑا ہے جو مسائل ہمارے دین میں دو دو چار کی طرح بالکل واضح اور قطعی ہیں۔ اگر ہمیں اس جہالت، اس منافقت، اور اس شرارت سے سابقہ نہ ہوتا تو ہمارا کام نہایت آسان تھا۔ ہماری قوم کو اسلام سے زیادہ کوئی چیز بھی محبوب نہیں ہے اور وہ اس کو اختیار کرنے کے لیے ہرگز کسی دلیل و حجت کی منتظر نہیں ہے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ وہ اسلام سے اچھی طرح آشنا نہیں ہے اس لیے اگر کچھ لوگ اس کو دھوکا دینا چاہیں تو بڑی آسانی سے دے سکتے ہیں۔

یہ مَیں نے جو کچھ عرض کیا ہے یہ میری تقریر کی تمہید تھی۔ چونکہ اکثر لوگ جو صحیح صورتِ حال سے ناواقف ہیں یا سادہ لوح واقع ہوئے ہیں، اعتراض کرتے رہتے ہیں کہ جب اس ملک کے لیڈر بار بار وعدہ کر رہے ہیں کہ ہم اس ملک میں اسلامی نظام ہی قائم کریں گے تو آخر جماعت اسلامی اس چیز کے لیے اس قدر کیوں ہنگامہ اٹھائے ہوئے ہے؟ اس لیے میں نے اس موقع پر اس کی وضاحت کر دینی ضروری سمجھی کہ ہم کن وجوہ سے اس بار بار کی یاددہانی کی زحمت برداشت کر رہے ہیں۔

اب میں آپ کو یہ بتانے کی کوشش کروں گا کہ ہم اس ملک میں کس طرح کے تغیّرات لانا چاہتے ہیں۔ اس کا اجمالی جواب تو میں آپ کو دے چکا ہوں کہ ہم اس ملک میں اسلام کو لانا چاہتے ہیں۔ خالص اسلام کو، سو فیصدی اسلام کو، زندگی کے ہر گوشہ میں اسلام کو۔ لیکن یہ سوال کا ایک اجمالی جواب ہوا۔ مجھے اس سے زیادہ تفصیل کے ساتھ آپ کو بتانا ہے کہ ہم اس ملک میں کس ہمہ گیر انقلاب کے طالب ہیں؟ ہم اس ملک میں بننے والے دستور کے متعلق یہ چاہتے ہیں کہ وہ سو فیصدی اسلام کے اصولوں پر بنے۔ ہم اس ملک میں قائم ہونے والی تہذیب کے متعلق یہ چاہتے ہیں کہ وہ سو فیصدی اسلام کا رنگ لیے ہوئے ہو۔ ہم اس ملک میں قائم ہونے والے نظامِ تعلیم کو چاہتے ہیں کہ وہ خالصًا اور کلیتہً کتاب و سنت کی اساس پر ہو۔ ہم اس

ملک کے معاشی نظام کو بھی خالص اسلامی اصولوں پر مبنی دیکھنا چاہتے ہیں۔ الغرض ہماری تمنا اور کوشش یہ ہے کہ اس ملک کی زندگی کے ہر گوشہ پر اللہ کا رنگ چڑھ جائے۔ کوئی کونا اور گوشہ بھی صبغۃ اللہ کی تنویر سے محروم نہ رہے۔ جب تک ایک نقطہ کے برابر بھی کسی گوشہ میں ایسی جگہ باقی رہے گی جس پر اسلام کا چھاپ نہ ہوگا، اس وقت تک ہم سمجھیں گے کہ ابھی ہمارا کام ختم نہیں ہوا اور ہم برابر اپنی کوشش جاری رکھیں گے۔ تا آنکہ اللہ تعالیٰ ہماری زندگی کے ہر گوشہ پر اپنے دین کو قائم فرما دے۔

سب سے پہلے آپ اس ملک کے بننے والے دستور کو لیجیے اور یہ دیکھیے کہ ہم اس میں کن باتوں کا ہونا ضروری اور لازمی سمجھتے ہیں۔ یہ میں یہاں واضح کر دینا ضروری خیال کرتا ہوں کہ میرے لیے اس وقت تفصیلات میں جانے کا موقع نہیں ہے۔ میں صرف اصولی باتوں ہی کی طرف اشارہ کر سکتا ہوں۔

ہم اس ملک کے دستور میں سب سے پہلی بات یہ چاہتے ہیں کہ اس میں خدا کی حاکمیت کا نہایت صاف اور واضح الفاظ میں اقرار کیا جائے۔ اگرچہ قرارداد مقاصد کے بعد خدا کی حاکمیت کے اقرار کا مسئلہ بظاہر ایک متفق علیہ حقیقت معلوم ہوتا ہے۔ لیکن درحقیقت صورت معاملہ یہ نہیں ہے۔ ہم مختلف وجوہ کی بنا پر یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ اس معاملہ میں ہمارے لیڈروں کے ذہن ابھی صاف نہیں ہیں۔ ہمارے لیڈر حضرات اس معاملہ میں قرآن مجید کے بجائے بعض مسلمان ممالک کے دساتیر سے الہام حاصل کر رہے ہیں۔ جس طرح بعض مسلمان ممالک کے دساتیر کا آغاز تو خدا کے نام سے ہوتا ہے لیکن خدا کے نام کے بعد پہلی ہی سطر جو شروع ہوتی ہے وہی خدا کے نام کی نفی کر دیتی ہے۔ اسی طرح شاید ہمارے لیڈر بھی یہ سوچ رہے ہیں کہ پاکستان کے دستور کی بسم اللہ تو خدا کے نام سے ہو لیکن اس کے بعد پورا دستور اپنے من مانے اصولوں پر بنا دیا جائے۔ جس کے معنی دوسرے الفاظ میں یہ ہوئے کہ اگر آپ اس دستور کو پڑھیں گے تو آپ محسوس کریں گے کہ آپ نے اس کو شروع تو کیا ہے اللہ کے نام سے لیکن ہے وہ درحقیقت امریکہ یا فرانس یا کسی اور کافر ملک کا

دستور۔ بلکہ اس کے لیے اس سے زیادہ موزوں تشبیہ یہ ہوگی کہ آپ نے آغاز تو کیا اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم اور بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے، لیکن اس کے بعد گنتہ صاحب یا دید کو پڑھنا شروع کر دیا۔ اگر فی الواقع ان حضرات کے پیشِ نظر یہ چیز ہے کہ وہ اللہ کے نام سے ایک ایسا دستور بنائیں جس کو اللہ کی توحید سے، اللہ کی تعلیم سے، اللہ کی شریعت سے، اللہ کے احکام سے کوئی تعلق نہ ہو، تو ان کے لیے زیادہ بہتر یہ ہوگا کہ وہ ایسے دستور میں اللہ کا نام نہ استعمال کریں۔ اس طرح وہ اللہ کے نام کا احترام نہیں قائم کریں گے بلکہ اللہ کے نام کی توہین کریں گے۔ اور اپنے جرم پر خدا کو گواہ ٹھہرائیں گے۔

یہ نہ خیال فرمایئے کہ یہ اندیشے میں محض بدگمانی کی بنا پر ظاہر کر رہا ہوں۔ بلکہ یہ جو کچھ عرض کر رہا ہوں نہایت معقول وجوہ کی بنا پر عرض کر رہا ہوں۔ دستوری سفارشات کی کمیٹیوں نے اب تک جو کچھ آپ کے سامنے رکھا ہے اس میں کے فیصدی اسلام آپ نے پایا ہے؟ ابھی پچھلے دنوں ہمارے سامنے ایک مضمون آیا تھا جو مرکزی حکومت کے ایک بڑے ذمہ دار آدمی کا لکھا ہوا تھا۔ اس میں خدا کی حاکمیت کی جو تشریح کی گئی تھی وہ جمہور کی حاکمیت سے ذرا بھی مختلف نہیں تھی۔ اس میں یہ ثابت کیا گیا تھا کہ پاکستان میں حکومت اگرچہ نظری طور پر تو اللہ تعالیٰ ہی کی ہوگی، لیکن عملاً چونکہ اس حکومت کو انسان ہی چلائیں گے، اس لیے حکومت درحقیقت انسانوں ہی کی ہوگی اور وہ جس طرز پر بھی حکومت کو چلائیں، وہ خدا ہی کی حکومت کہلائے گی۔ ہمارے نزدیک خدائی حکومت کی یہ تشریح نہ صرف غلط ہے، بلکہ یہ نہایت غلیظ قسم کا شرک ہے۔ ہم اس ملک میں ایسا دستور نہیں چاہتے جو خدا کی حاکمیت کے تصور کو اتنا مبہم چھوڑ دے کہ اس کی ہر قسم کی من مانی تاویلیں کی جا سکیں، اور اہلِ اغراض اس کو ہر قسم کے معنی پہنا سکیں۔ ہم صرف یہ نہیں چاہتے کہ دستور میں خدا کی تکوینی حاکمیت کا اقرار کیا جائے، بلکہ خدا کی تکوینی حاکمیت کے ساتھ ساتھ اس کی تشریعی حاکمیت کے اقرار کو بھی ضروری سمجھتے ہیں۔ ہم صرف یہی نہیں چاہتے کہ لا الٰہ الا اللہ پڑھ لیا جائے بلکہ اس کے ساتھ محمد رسول اللہ کا پڑھنا بھی ناگزیر ہے۔ اس لیے کہ جب تک لا الٰہ الا اللہ کے ساتھ محمد رسول اللہ کا اقرار نہ شامل ہو، اس وقت تک لا الٰہ الا اللہ کہنا بھی بے معنی ہے۔ اللہ کی حاکمیت ہماری عملی زندگی پر اسی وقت مؤثر ہو سکتی ہے

جب اُس کی تکوینی حاکمیت کے ساتھ اُس کی تشریعی حاکمیت پر بھی ایمان لایا جائے، اور خدا کی تشریعی حاکمیت کے مظہر چونکہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، اس لیے ضروری ہے کہ آنحضرت صلعم کو زندگی کے ہر شعبے میں واجب الاطاعت ہادی اور واجب الاطاعت لیڈر مانا جائے۔ جب تک کہ یہ نہ مانا جائے کہ ہمارے حکمرانِ حقیقی نے اپنے احکام و قوانین سے ہم کو مطلع کرنے کے لیے محمد رسول اللہ صلعم کو بھیجا ہے اور رسول اللہ کے امر و ارشاد کے مقابلہ میں کسی اور کے امر و حکم کو تسلیم کرنا کفر ہے، اس وقت تک نہ اللہ کی حاکمیت کے اقرار کا حق ادا ہو سکتا ہے نہ رسول کی رسالت کے اقرار کا حق ادا ہو سکتا ہے۔ اس لیے جب ہم یہ کہتے ہیں کہ دستور میں خدا کی حاکمیت کا اقرار کیا جائے تو اُس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ دستور میں کتاب اللہ کی اطاعت، رسول اللہ صلعم کی اطاعت، اور سنت خلفائے راشدین کی پیروی کا اقرار کیا جائے۔ خدا کی حاکمیت کا منشاء صحیح صحیح طور پر اُسی وقت بروئے کار آسکتا ہے جب اُس کا اقرار مذکورۂ بالا حقیقتوں کے اقرار کے ساتھ کیا جائے۔ اس کے بغیر خدا کی حاکمیت کا اقرار کرنا یا نہ کرنا، دونوں یکساں ہیں۔ ہم اگر اجتماعی طور پر متدین کر زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں اس طرح خدا کی حاکمیت کا اقرار کرنا ہوگا۔ اس کے بغیر یہ خیال کرنا کہ ہم نے اپنے دستور میں خدا کی حاکمیت کا اقرار کیا ہے ایک بالکل بے معنی سی بات ہے۔ میں یہ ظاہر کر دینا چاہتا ہوں کہ جن مسلمان ممالک میں اس وقت دستور کے نام سے کوئی چیز موجود ہے اُن میں سے کسی دستور میں بھی ان شرائط کے ساتھ خدا کی حاکمیت کا اقرار نہیں کیا گیا ہے۔ اس لیے پاکستان کا دستور بناتے وقت اُن کو رہنمائی کے لیے اپنے سامنے رکھنا، ایک نہایت ہی سخت قسم کی احمقانہ غلطی ہوگی۔

دوسری چیز جو ہمارے دستور کی نمایاں خصوصیت ہونی چاہیے وہ یہ ہے کہ یہ تقسیم دین و دنیا کے نظریے کی تمام آلودگیوں اور خرابیوں سے بالکل پاک ہو۔ وہ سو فیصدی اس نظریہ پر بنایا جائے کہ ہمارا دین ہماری دنیا کے ہر گوشے پر حاوی ہے۔ ہمارا دین عیسائیوں یا ہندوؤں کے دین کی طرح صرف پوجا پاٹ کی حد تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ وہ ہماری زندگی کے ہر شعبے کے متعلق ہم کو احکام و ہدایات دیتا ہے، اور ان تمام احکام و ہدایات کو وہ ہمارے لیے یکساں طور پر واجب اور ضروری قرار دیتا ہے۔ وہ

جس طرح ہمیں یہ بتاتا ہے کہ ہم مسجد میں جائیں تو کس طرح نماز پڑھیں، اُسی طرح ہم کو یہ بھی بتاتا ہے کہ جب ہم بازار میں جائیں تو کس طرح سے معاملات کریں۔ وہ جس طرح ہمیں یہ سکھاتا ہے کہ ہماری انفرادی زندگی کی ترقیوں کے لیے کن اصولوں کی پیروی ضروری ہے اُسی طرح وہ ہم کو یہ بھی بتاتا ہے کہ ہماری اجتماعی زندگی کی صلاح و فلاح کے لیے صحیح رہنما اصول کیا ہیں۔ وہ جس طرح ہم کو نماز کے اصول سکھاتا ہے اور یہ کہتا ہے کہ اِن اصولوں کی ادنیٰ خلاف ورزی سے ہماری نماز فاسد ہو جائے گی اُسی طرح وہ ہمیں سیاست کے آئین سکھاتا ہے اور یہ کہتا ہے کہ اس آئین کی خلاف ورزی سے ہماری حکومت (اگرچہ بظاہر اُس پر اسلام کا بیبل لگا ہوا ہو) فساد فی الارض بن جائے گی۔

اس حقیقت نفس الامری کے پیش نظر یہ ضروری ہے کہ اِس ملک کے دستور کے ذریعہ سے ہماری انفرادی و اجتماعی زندگی کے ہر شعبے کو خدا کے قانون کے تابع کیا جائے، اور عیسائیوں اور ہندوؤں کے جاہلی تصورات سے اس کو بالکل پاک رکھا جائے۔ اگرچہ اِن الفاظ سے میرا مدعا واضح ہے لیکن میں اس کو مزید واضح کرنے کے لیے یہ کہہ دینا چاہتا ہوں کہ ہم صرف یہ نہیں چاہتے ہیں کہ اس ملک میں شیخ الاسلامی کا کوئی منصب قائم کر دیا جائے، یا کچھ علماء کو اوقاف و مساجد کی تولیت سپرد کر دی جائے، یا مسلمانوں کے طلاق و نکاح کے مسائل کو طے کرنے کے لیے کچھ قاضی مقرر کر دیے جائیں۔ اس طرح کی باتیں جو لوگ سوچتے ہیں یا جو ان کو اسلامی حکومت کی اصلی خصوصیات سمجھتے ہیں وہ ہمارے نزدیک نہایت ہی احمق قسم کے لوگ ہیں اور جتنے ہی جلدی وہ اپنی اس حماقت کا علاج کریں اتنا ہی اچھا ہے۔ ہم صرف مساجد اور قبرستانوں کی تولیت کے لیے جدوجہد نہیں کر رہے ہیں بلکہ ہم اس خداداد مملکت کے چپے چپے پر اللہ کے دین کو قائم و جاری کرنے کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں۔ اگر ہمارے لیڈروں کو یہ غلط فہمی ہو کہ وہ اس قسم کی کچھ باتیں کر کے اس ملک کے جمہور کو مطمئن کر دیں گے تو وہ اپنے ذہن سے اس غلط فہمی کو نکال دیں۔ دس بارہ سال کی ہماری لگاتار محنت، جو دین کے صحیح تصور کے پھیلانے پر صرف ہوئی ہے الحمدللہ اب وہ اپنا اثر پیدا کر چکی ہے اور ہماری قوم کا ذہن اب اس قدر تبدیل ہو چکا ہے کہ وہ اس قسم کی چیزوں سے مطمئن نہیں ہو سکتی۔ اب اگر وہ

مطمئن ہو سکتی ہے تو صرف اسی بات سے ہو سکتی ہے کہ زندگی کے ہر شعبے کو بغیر کسی استثناء اور تفریق کے اللہ کی شریعت اور اس کے قانون کے تابع کیا جائے۔ اب ہماری قوم عیسائیت اور اسلام کے فرق کو اچھی طرح سے سمجھنے لگ گئی ہے۔ اب وہ اس بات سے ناواقف نہیں رہی ہے کہ تفریق دین و دنیا کا تصور کوئی اسلامی تصور نہیں ہے بلکہ یہ سرتاسر جاہلی تصور ہے جو مسلمانوں نے اپنے دور زوال میں عیسائیوں سے اخذ کیا ہے۔ اب ہمارے ذہین نوجوانوں سے یہ حقیقت بھی مخفی نہیں رہی ہے کہ اسلام کے دور اول میں اگر کوئی شخص دنیا کو دین سے الگ کرنے کی کوشش کرتا تو وہ سزا سے نہ بچ سکتا

تیسری چیز جو اس ملک کے دستور میں نمایاں ہونی چاہیے وہ یہ ہے کہ اس میں شہریت کے شرائط اور اس کے حقوق وہی معین ہونے چاہئیں جو اسلام نے ایک اسلامی ریاست کے لیے معین کیے ہیں۔ اس کے چلانے کی تمام ذمہ داری صرف ان لوگوں پر ڈالی جائے جو اسلام پر ایمان رکھتے ہوں، جو قولاً اسلام کا اقرار کرتے ہوں اور عملاً اس کے اصولوں پر گامزن ہوں۔ جو زندگی کے معاملات میں رہنمائی حاصل کرنے کے لیے اللہ اور اس کے رسول کے سوا کسی اور کی طرف الہام حاصل کرنے کے لیے رجوع نہ کرتے ہوں۔ میرے اس کہنے کا منشاء یہ نہیں ہے کہ اسلامی ریاست میں ان لوگوں کے کچھ حقوق نہیں ہیں، جو اسلام کے اصولوں پر ایمان نہ رکھتے ہوں۔ اسلامی ریاست اپنے اندر کی غیر مسلم اقلیتوں کو اس سے کہیں زیادہ حقوق دیتی ہے جتنے حقوق موجودہ زمانے کی مدعی جمہوریت حکومتیں اپنی اقلیتوں کو دیتی ہیں۔ اسلامی حکومت یہ حقوق پوری ایمانداری سے دیتی ہے، قرآن مجید اور احادیث کے احکام کے تحت دیتی ہے۔ اللہ اور رسولؐ کی ضمانت کے ساتھ دیتی ہے۔ لیکن مجھے اس بات کے ظاہر کرنے میں کوئی تردد نہیں ہے کہ ایک اصولی ریاست ہونے کی وجہ سے اسلامی ریاست اپنے چلانے کی ذمہ داریاں ان لوگوں پر نہیں ڈالتی جو ان اصولوں پر ایمان نہ رکھتے ہوں جن اصولوں پر اسلامی ریاست قائم ہوتی ہے۔

پھر جس طرح یہ ضروری ہے کہ ہمارے دستور میں شہریت کے شرائط وہی ہوں جو اسلام نے قرار دیے ہیں، اُسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ شہریت کے حقوق بھی وہی ہوں جو اسلام نے بخشے ہیں

اور ان حقوق پر کسی حال میں بھی حکومت کو دست درازی کرنے کا کوئی حق نہیں ہونا چاہیے۔ ایک اسلامی ریاست میں خدا اور اُس کے رسول کے مقرر کیے ہوئے حدود کے اندر ہر شخص آزاد ہے اور جو شخص اپنی آزادی خدا اور اس کے رسول کے مقرر کیے ہوئے حدود کے اندر استعمال کر رہا ہے اس کی آزادی کو کسی عذر اور بہانے پر بھی سلب نہیں کیا جا سکتا۔ اسلامی حکومت کے وجود کا مقصد ہی یہ ہے کہ وہ باشندگانِ ملک کے لیے خدا کے قانون کے تحت بالکل آزاد رہنے کے مواقع بہم پہنچائے۔ اگر حکومت یہ مقصد پورا کرنے کے بجائے لوگوں کی آزادی پر ناجائز دست درازیاں شروع کر دے تو وہ اپنا مقصدِ وجود ہی بالکل کھو بیٹھتی ہے اور اس کو اس بات کا کوئی حق نہیں باقی رہ جاتا کہ وہ لوگوں سے اطاعت کا مطالبہ کرے۔ اسلامی حکومت لوگوں پر خلافِ شریعت پابندیاں عائد کرنے اور ان کے لیے مختلف حیلوں بہانوں سے مختلف قسم کی بیڑیاں ایجاد کرنے کے بجائے اس بات کی ذمہ دار ہوتی ہے کہ اگر بندگانِ خدا کی راہ میں اس طرح کی کچھ خلافِ شریعت رکاوٹیں ہوں تو ان کو دُور کرے۔ دنیا میں ظالم اور جبار فرمانرواؤں اور حکومتوں نے انسانوں کے فطری حقوق پر جو تعدیاں اور دست درازیاں کی ہیں اسلام ان کو مٹانا چاہتا ہے نہ کہ ان کو باقی رکھنا یا ان میں کوئی اضافہ کرنا چاہتا ہے۔ ہمارے دستور سازوں کو اس پہلو سے ہرگز نہیں سوچنا چاہیے کہ اربابِ اقتدار کے اقتدار کو بہر شکل قائم رکھنے کے لیے دستور میں کیا کیا گنجائشیں پیدا کی جا سکتی ہیں۔ بلکہ انہیں اُن رخنوں کو بند کرنا چاہیے جن سے انسانی حقوق پر چھاپے مارے جا سکتے ہیں۔

اسلام میں حکومت مقصود بالذات شے نہیں ہے۔ مقصود بالذات شے صرف اللہ کی اطاعت اور بندگی کے لیے آزادی ہے۔ حکومت اس آزادی کی حفاظت اور اس سے متمتع ہونے کے اسباب و وسائل فراہم کرنے کا ایک ذریعہ اور وسیلہ ہے۔ اس راہ میں جو رکاوٹیں پیش آتی ہیں ان کو وہ دُور کرتی ہے۔ اس راستہ میں جو خطرات پیش آتے ہیں وہ ان کو دفع کرتی ہے۔ اور اس راہ کی آخری منزل تک پہنچنے کے لیے جو چیزیں مطلوب ہوتی ہیں حکومت ان کو فراہم کرتی ہے۔ وہ بجائے اس کے کہ بندگانِ خدا کی آزادی سلب کرنے کے لیے عذرات اور بہانے تلاش کرے اور خدا کی صراطِ مستقیم پر

بڑھنے سے خدا کے بندوں کو روکے۔ وہ لوگوں کو دعوت دیتی ہے کہ اگر ان کی راہ میں کوئی مزاحمت ہو تو وہ اس کو باخبر کریں تاکہ وہ ان کی مزاحمت کو دُور کر کے ان کے لیے اس راہ کے سفر کو آسان کر دے۔

جو حکومت بندگانِ خدا کے لیے یہ چیز فراہم کر دے جس کا میں نے ابھی ابھی آپ کے سامنے ذکر کیا ہے اس حکومت کا نام ہماری اسلامی اصطلاح میں خلافت علیٰ منہاج السنت ہے یہی حکومت ہے جس کا درجہ اور مرتبہ یہ ہے کہ اس کی اطاعت سے الگ ہو کر کوئی شخص نجات نہیں حاصل کر سکتا۔ اس کے لیے اپنی جان اور مال کو قربان کرنا، اس کی حفاظت میں گردنیں کٹانا، اس کے بقا اور اس کی ترقی کے لیے ہر قسم کے مصائب جھیلنا، دین و دنیا دونوں کی سعادت ہے۔ کیونکہ یہ حکومت ہمارے لیے خدا کے قانون کے تحت زندگی بسر کرنے کی آزادیاں فراہم کرتی ہے۔ اس کے زیر سایہ بسنے والے یہ محسوس کرتے ہیں کہ خدا اور اس کی شریعت کے سوا ان کے اوپر کسی کا کوئی زور نہیں ہے اور اگر کوئی شخص ان کی اس آزادی کو سلب کرنا چاہے گا تو یہ حکومت اس بات کی ذمہ دار ہے کہ وہ اس کی چھینی ہوئی آزادی کو واپس دلائے گی۔

اس اصولی حقیقت کو سامنے رکھتے ہوئے میں اس ملک کے لیڈروں کو آگاہ کرتا ہوں کہ وہ ہمارے سابق انگریز آقاؤں کی طرح ہمارے لیے صرف مسجد کے اندر نماز اور اذان کی آزادی محفوظ کرنے کی فکر نہ فرمائیں بلکہ ایک ایسا دستور بنائیں جو انسانوں کو انسانوں کی غلامی اور انسانوں کے بنائے ہوئے جابرانہ قوانین کی ہر تعدی سے محفوظ کرتا ہو۔ ایک ایسا دستور بنائیں جو ہر بندۂ خدا کو اس بات کی ضمانت دیتا ہو کہ اس کے جان و مال، اس کے فکر و خیال اور اس کے عقیدہ و رائے کی آزادی پر کوئی پابندی اُس پابندی کے سوا عائد نہیں کی جائے گی جو خدا اور اس کے رسول نے عائد کی ہے۔ ایک ایسا دستور بنائیں جو ہر شہری کو ایک طرف عام افراد کی تعدیوں سے محفوظ کرنے کی ذمہ داری لیتا ہو اور دوسری طرف خود حکومت کی بھی ہر قسم کی تعدیوں سے محفوظ رکھنے کی ضمانت دیتا ہو۔

جو ریاست خدا کے بندوں کے لیے یہ حقوق اور آزادیاں مہیا کر دے وہ ریاست خدا کی زمین پر اُس کی بہت بڑی رحمت ہے۔ اس طرح کی ریاست کے لیے ہر قسم کی جانی و مالی قربانی کرنا جیسا کہ

میں نے عرض کیا، اُس کے شہریوں کا فرض ہے۔ اگر اِس ریاست کو کوئی خطرہ پیش آجائے تو ہمارے لیے حرام ہے کہ ہم اپنی ذات کو ریاست کی ہستی سے زیادہ عزیز رکھیں۔ اگر ریاست کی سالمیت کو کوئی معمولی سے معمولی نقصان بھی پہنچنے کا اندیشہ ہو تو ہمارے لیے حرام ہے کہ ہم اپنے جسموں کے پُرزے اُڑے بغیر اُس کی سالمیت پر آنچ آنے دیں۔ ایسی ریاست کی زمین کا ایک ایک چپہ ہمارے لیے مسجد کی طرح مقدس و محترم ہے اور اُس کے تحفظ کی ہر جدو جہد ہمارے لیے جہاد فی سبیل اللہ کا درجہ رکھتی ہے۔ ہمارے لیے حرام ہے کہ ریاست مدد کی محتاج ہو اور ہم اپنی جیب میں مال کا ایک حبہ یا اپنی رگوں میں خون کا ایک قطرہ بھی بچا کے رکھ چھوڑیں۔ اگر ریاست نے ہمارے لیے خدا کی صراطِ مستقیم کھول دی ہے اور اُس پر چلنے کے لیے جن حفاظتوں اور جن سہولتوں کے ہم محتاج ہیں وہ ساری کی ساری ہمارے لیے فراہم کر دی ہیں تو اُس نے ہمارے لیے وہ سب کچھ فراہم کر دیا جس کی ہم اِس دنیا میں تمنا کر سکتے ہیں، اس لیے اُس کے تحفظ اور اس کی ترقی کے لیے ہمارا فرض ہے کہ ہم اپنی عزیز سے عزیز چیز بھی بے دریغ قربان کریں اور اس کو اللہ کی رضا کا موجب سمجھیں۔

یہ تین باتیں جو میں نے عرض کی ہیں یہ اسلامی دستور کی روح ہیں اور انہی کے معیار سے جانچ کر یہ دیکھا جا سکتا ہے کہ ایک ریاست کا مزاج اسلامی ہے یا جاہلی۔ ہم اس کو سونگھ کر دیکھ لیں گے کہ اُس کے اندر ان چیزوں کی خوشبو پائی جاتی ہے یا نہیں۔ اگر ہم نے محسوس کیا کہ یہ خوشبو اُس کے اندر موجود ہے تو ہم یہ سمجھ لیں گے کہ یہ دستور ایمان، اسلام اور قرآن کی بنیادوں پر بنا ہے۔ اور اگر یہ خوشبو ہم نے نہ پائی تو اگرچہ اس کا افتتاح بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے ہوا ہو لیکن ہم یہی سمجھیں گے کہ ہمارے لیے یہ مہلک سمیات پر مشتمل ایک نسخہ لکھا گیا ہے اور ہم کو دھوکا دینے کے لیے اس پر ھوالشافی لکھ دیا گیا ہے۔ ھوالشافی لکھ کر سمِ قاتل اور زہر ہلاہل کو شہد و شکر نہیں بنایا جا سکتا۔ اگر ھوالشافی لکھیے تو اس میں دوائیں بھی وہی درج کیجیے جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے قرابادینِ اعظم سے لی گئی ہوں۔ اور اگر آپ ہم کو زہر پلانا چاہتے ہیں تو خدا کے لیے اس کو ھوالشافی کے عنوان سے نہ پلائیے۔ یہ خدا اور اس کے بندوں دونوں کے ساتھ غداری ہوگی۔

ان اصولی اور بنیادی باتوں کے علاوہ دستور کی بعض اور چیزوں کی طرف بھی یہاں اشارہ کر دینا مناسب ہوگا۔ ایک اسلامی دستور کی ضروری خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس کے اندر ایگزیکٹو کی ساری مطلق العنانیوں کا پوری طرح سدباب کر دیا جائے۔ عام رعایا جس قانون کی تابع ہو، ایگزیکٹو کے ارکان بھی اسی قانون کے تابع ہوں جس طرح عام رعایا کو ان کی بدکرداریوں پر عدالتوں میں مقدمہ چلا کر سزا دلائی جا سکتی ہے، اسی طرح ایگزیکٹو کے بڑے سے بڑے ارکان کو بھی انکی بدکرداریوں پر عام عدالتوں میں عام قانون کے ماتحت مقدمہ چلا کر سزا دلائی جا سکتی ہو۔

اسلامی شریعت میں ایگزیکٹو کا منصب صرف خدا کی شریعت کی تنفیذ اور اس کا اجرا ہے۔ ان کو ہرگز یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ خدا کی شریعت میں کوئی تغیر کر سکیں یا اس کے کسی جزو کو منسوخ کر سکیں، یا اس کے کسی حصے کو من مانے قوانین سے بدل سکیں۔ اسلامی شریعت کے اندر محمد رسول اللہ صلعم بھی اسی طرح اللہ کے قوانین کے تابع ہیں جس طرح ایک عام مسلمان ان قوانین کے تابع ہے۔ اس وجہ سے اسلامی نظام کے اندر ایگزیکٹو کا کوئی اونچا سے اونچا فرد بھی یہ حق نہیں رکھتا کہ وہ اپنے لیے قانون سے بالاتر کوئی مقام مخصوص کرنے کی کوشش کرے، یا قانون کو معطل یا ملتوی کرنے کی جرأت کرے۔ اسلامی قانون خدا اور اس کے رسول کا بنایا ہوا ہے اور خدا اور خدا کے رسول کو ہی یہ حق حاصل ہے کہ وہ اس کے اندر ترمیم یا تغیر کر سکیں۔ کسی دوسرے کا یہ منصب نہیں ہے کہ وہ اس کے اندر سرمو تغیر کر سکے۔

اگر آپ نے اپنے دستور کے اندر کوئی ایسا خلا چھوڑا جو آپ کے ایگزیکٹو کے ارکان کو اس بات کا موقع دیتا ہو کہ وہ کسی پہلو سے اپنے آپ کو عام قانون سے بالاتر بنا سکیں تو آپ اس ملک میں قیصر و کسریٰ کا نظام ہی لائیں گے، وہ نظام نہیں لائیں گے جو حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمر فاروقؓ نے قائم کیا تھا۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمر فاروقؓ نے جو نظام قائم کیا تھا اس کی سب سے بڑی خصوصیت کا اظہار خود حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اس طرح فرما دیا تھا "کہ میں تمہارے اندر خدا کی شریعت کو جاری کرنے والا ہوں، اپنی طرف سے کوئی نئی بات کرنے والا نہیں ہوں۔ اور اگر میں اس شریعت سے سرمو انحراف کروں تو تم مجھے ٹھیک کر دینا"

اسی طرح عدلیہ سے متعلق بھی دستور میں چند باتوں کی تصریح نہایت ضروری ہے جو عدلیہ کے

مزاج کو اسلامی بنانے کے لیے ضروری ہیں۔

پہلی چیز یہ ہے کہ عدلیہ کو ایگزیکٹو کی ہر قسم کی مداخلت کے امکانات سے بالکل محفوظ کیا جائے تاکہ بے لاگ انصاف، جو ہر عدلیہ کے قیام کا اصلی مقصد ہے، ہر شخص کو حاصل ہو سکے

دوسری چیز یہ ہے کہ ہر باشندۂ ملک کے لیے مفت عدل و انصاف مہیا کرنے کی ذمہ داری لی جائے تاکہ ہر مظلوم بغیر کوئی قیمت ادا کیے انصاف حاصل کر سکے۔ اسلامی نظام میں ہر مظلوم کا حکومت پر یہ حق ہو جاتا ہے کہ اس کی داد رسی ہو، اس کو اس کا چھنا ہوا حق ملے، اور اس کے ساتھ انصاف کیا جائے۔ یہ بات نہایت ہی شرمناک ہے کہ ایک شخص کو اپنا واجبی حق حاصل کرنے کے لیے قیمت ادا کرنی پڑے۔ جس نظام میں لوگوں کو اپنے واجبی حقوق حاصل کرنے کے لیے بھی قیمت ادا کرنی پڑتی ہو وہ نظام ہرگز اسلامی نظام نہیں ہو سکتا۔ خلافتِ راشدہ میں کسی شخص کو بھی اپنی مظلومیت کی داد حاصل کرنے کے لیے کوئی قیمت نہیں ادا کرنی پڑتی تھی۔ جو شخص مظلوم ہوتا حکومت پر اس کا یہ ناقابلِ انکار حق قائم ہو جاتا کہ وہ اس کے لیے انصاف مہیا کرے۔

تیسری چیز یہ ہے کہ ہمارے دستور میں اس بات کی ضمانت دی جائے کہ راعی اور رعایا، حاکم اور محکوم، امیر اور مامور ہر ایک کے لیے ایک ہی قانون اور ایک ہی نظامِ عدالت ہوگا۔ اسلامی شریعت میں اس بات کی کوئی گنجائش نہیں ہے کہ قانون اور نظامِ عدالت میں کسی قسم کی تفریق کی جا سکے۔ جاہلی نظاموں میں قانونی مساوات کا دعویٰ تو بڑی بلند آہنگی سے کیا جاتا ہے اور ہر ملک کے دستور میں قولاً اس بات کی ضمانت دی جاتی ہے کہ قانون کی نگاہ میں سب برابر ہوں گے لیکن عملاً نہ صرف ایگزیکٹو کے ارکان، نہ صرف جمہوریتوں کے صدر، نہ صرف ملک کے بادشاہ، بلکہ بعض حالات میں پارلیمنٹوں کے ارکان اور ملک کے دوسرے شرفاء و اعیان کو بھی عام قانون اور عدالتوں کی دارو گیر سے بالکل بالاتر کر دیا جاتا ہے۔ یہ صورتِ حال ایک خالص جاہلی صورتِ حال ہے جس کو اسلام سے کوئی دُور کا بھی تعلق نہیں! اسلام میں غریب اور امیر، امیر اور مامور سب کے لیے ہر حالت میں ایک ہی قانون اور ایک ہی نظامِ عدالت ہے۔ اور اسلام نے اس بات کو کسی حال میں بھی روا نہیں رکھا ہے کہ قانون

اور عدالت کے نظام میں سرِمو کوئی تفریق کی جائے۔ یہ مسئلہ کوئی استنباطی اور اجتہادی مسئلہ نہیں ہے بلکہ اس کے بارے میں قرآن اور پیغمبر صلعم کی واضح تصریحات بھی موجود ہیں اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کے عہد کی متعدد عملی اور واقعاتی شہادتیں بھی موجود ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں بعض ترفع پسند سرکاری حکام نے حضرت عمرؓ کے سامنے حکومت کی ساکھ قائم رکھنے کے لیے یہ خیال پیش کیا تھا کہ ایگزیکٹو کے ارکان کو عام قانون اور عام عدالتوں کی دار و گیر سے ایک حد تک بالاتر کر دیا جائے۔ لیکن حضرت عمرؓ نے اُن کی اس بات کو تسلیم نہیں کیا۔ اور صاف صاف یہ فرمایا کہ اسلامی شریعت میں جب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قانون سے بالاتر کوئی جگہ حاصل نہیں تھی تو میں کسی دوسرے کو قانون اور عدالت کی دار و گیر سے، کسی درجے میں بھی سہی، کس طرح بالاتر قرار دے سکتا ہوں۔ حضرت عمرؓ کے اس اعلان نے اس حقیقت کو بالکل غیر مشتبہ طور پر واضح کر دیا کہ اسلام نے ہر شخص کے لیے قانونی مساوات کا جو حق تسلیم کیا ہے وہ حق ایسا نہیں ہے جو ایک طرف قانونی مساوات کے بلند بانگ دعوے کے ساتھ لوگوں کو دیا جائے اور دوسری طرف انتظامی قوانین (Administrative Laws.) کے ہتھکنڈوں کے ذریعے اُس حق کو بالکل سلب کر لیا جائے اور معاشرے کے اکابر مجرمین کو قانون اور عدالت سب کی گرفت سے بالکل آزاد کر دیا جائے تاکہ وہ خدا کی زمین کو ظلم اور فساد سے بے روک ٹوک بھرتے رہیں۔

اسلام نے جس قانونی مساوات سے دنیا کو آشنا کیا ہے اُس کی میزان میں فاطمہ بنت محمدؐ اور ایک معمولی بدوی عورت بالکل مساوی درجہ پر ہیں۔ حضرت عمرؓ ایک معمولی بدوی کی پشت پر جس طرح کوڑے لگوا دیتے تھے اسی طرح ایک بڑے سے بڑے گورنر اور بڑے سے بڑے فاتح کو بھی، اگر کسی جرم کا مرتکب پاتے تو بے تکلف عام قانون کے تحت اُس کو سزا دلوا دیتے۔ وہ جس قانون کو دوسروں پر جاری کرتے تھے اپنے آپ کو بھی اسی قانون کے ماتحت سمجھتے تھے اور بار بار یہ کہا کرتے تھے کہ جس طرح میں دوسروں کو انصاف کے آگے جھکاؤں گا اسی طرح خود اپنے آپ کو بھی انصاف کے آگے جھکاؤں گا۔ عدلیہ سے متعلق ہمارے دستور کو اس بات کی تصریح کرنی چاہیے کہ وہ قانون سازی کے معاملے میں

اول تو کتاب وسنت کو اصل ماخذ تسلیم کرے گی، ثانیاً وہ کتاب وسنت اور اجماعِ صحابہ کے حدود کے خلاف کبھی کوئی قدم نہ اٹھائے گی۔ عام تدابیر اور مصالح کے لیے اُس کو قانون سازی کا حق حاصل ہے، لیکن یہ حق اس شرط کے ساتھ مشروط ہے کہ کوئی قانون خدا اور رسولؐ اور اجماعِ صحابہ کے خلاف نہیں بنایا جائیگا۔ جو قانون خدا، اس کے رسول اور اجماعِ صحابہ کے خلاف ہو وہ اسلام میں باطل ہے۔

اسی طرح ہمارے ائمہ اور فقہاء نے جو اجتہادات فرمائے ہیں وہ بڑی قدر وقیمت رکھتے ہیں۔ ہمارے ائمہ اجتہاد کے تمام شرائط کے حامل تھے اس لیے، اگرچہ ان کے اجتہادات اور استنباطات کو غلطی سے مبرّا نہ قرار دیا جاسکے، تاہم یہ کہنا کچھ بیجا نہیں ہے کہ بحیثیت مجموعی حق وصواب سے جس قدر اقرب ان کا اجتہاد ہے دوسروں کا اجتہاد نہیں ہوسکتا۔ اس لیے کوئی ایسا اجتہاد جو تمام ائمہ کے اجتہاد سے مختلف ہو نہ عامہ مسلمین کو مطمئن کرسکے گا نہ اہلِ علم کو۔ پس حق سے قریب تر راہ اس معاملہ میں یہ ہے کہ کوئی ایسا قانون نہ بنایا جائے جو تمام ائمہ اہلِ سنت کے اجتہاد کے خلاف ہو بلکہ انہی میں سے جس کی رائے کتاب وسنت اور شریعت کے مقتضیات سے زیادہ اقرب نظر آئے اختیار کرلی جائے اور اسی کے مطابق قانون بنایا جائے۔

اب میں مختصراً آپ کو یہ بتاؤں گا کہ ہم اس ملک کی تعلیمی وتمدنی اور معاشرتی ومعاشی زندگی میں کس قسم کے تغیرات چاہتے ہیں۔ اگرچہ ان مسائل پر مجھے تفصیل سے کچھ کہنے کا موقع نہیں ہے، تاہم بعض اشارات ضروری ہیں تاکہ فی الجملہ ہمارا نقطۂ نظر آپ پر واضح ہوسکے۔

میں سب سے پہلے تعلیم کے متعلق کچھ کہوں گا۔ اس مسئلہ کو مقدم رکھنے کی وجہ یہ ہے کہ اگر اس ملک میں کوئی تبدیلی اور کوئی اصلاح ہونی ہے تو وہ بہرحال تعلیم کی اصلاح ہی سے شروع ہوسکتی ہے۔ تعلیم ہی ہر اصلاح وتغیر کی بنیاد ہے۔ اگر تعلیم کی اصلاح نہ ہوئی تو اس ملک میں اصلاح وتغیر کا کوئی قدم بھی نہیں اٹھایا جاسکے گا۔

آپ اس حقیقت سے ناواقف نہیں ہوسکتے کہ ہمارے ملک میں تعلیم کے نام سے آج جو ربانہ بجایا جارہا ہے وہ بعینہٖ وہی ربانہ ہے جو انگریز ہمیں بجانا سکھا گیا تھا۔ انگریزوں

نے یہ نظام تعلیم اس ملک میں اس لیے نہیں جاری کیا تھا کہ اس سے آپ کی خودی بیدار ہو۔ آپ کی نسلیں خود اپنی تاریخ، خود اپنے فلسفے اور خود اپنے قومی و ملی مقاصد سے آشنا ہوں۔ ان کی رگوں کا خون خود ان کی اپنی پامالیوں پر غیرت و حمیت سے جوش میں آئے۔ ان کا اپنا ماضی، جو فراموش ہو چکا ہے، از سر نو ان کے حافظہ کی نگاہوں کے سامنے آن کھڑا ہو اور ان کو مستقبل کی اولو العزمیوں کے لیے دعوتِ عمل دے۔ بلکہ انہوں نے یہ نظامِ تعلیم اس لیے جاری کیا تھا کہ اس ملک میں ان کو جو اقتدار حاصل ہو گیا تھا اس کی گاڑی کھینچنے کے لیے انہیں دیسی قلی حاصل ہوتے رہیں۔ لارڈ میکالے اور اس کی ذریات کو ہمارے ساتھ اتنی ہمدردی نہیں ہو سکتی تھی کہ وہ اس ملک میں کوئی ایسا نظامِ تعلیم جاری کرتے جو ہم کو خود ہمارے نصب العین سے آشنا کرتا۔ لیکن ہماری بدقسمتی دیکھیے کہ ملک کے آزاد ہو جانے کے کئی سال بعد تک بھی اس نظامِ تعلیم میں سر مُو کوئی تبدیلی نہیں کی گئی اور اگر کوئی تبدیلی کی گئی ہے تو وہ اس غرض کو پیش نظر رکھ کر ہرگز نہیں کی گئی ہے کہ اس کو کچھ اپنے قومی یا ملی حوصلوں کے لیے سازگار بنایا جائے بلکہ اس رنگ کو اور زیادہ تیز اور شوخ کرنے کی کوشش کی گئی ہے جو انگریز اس پر چڑھا گیا تھا۔

اس نظامِ تعلیم سے اگر کسی شخص کو تھوڑی بہت بھی واقفیت ہے تو وہ اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتا کہ یہ ہمارے نوجوانوں کے اندر اسلام کے بجائے جاہلیت کا احترام پیدا کرتا ہے۔ یہ ہماری اپنی نسلوں کی نگاہوں میں ان کے ماضی کو حقیر ٹھہراتا ہے۔ یہ ہمارے اپنے فرزندوں کو یہ سکھاتا ہے کہ وہ اپنے باپ دادا کو گالیاں دیں۔ اگر اس نظام کے تحت تعلیم پا کر کوئی شخص اپنے بزرگوں کو گالیاں نہیں دیتا تو یا تو وہ ایک مادر زاد ولی ہے یا پھر وہ اس نظامِ تعلیم کا صحیح فرزند نہیں ہے۔ ورنہ اس میں ذرا شبہ نہیں ہے کہ انگریزوں نے اس کو اسی مقصد کے لیے جاری کیا تھا کہ ہماری نئی نسلوں کی خودی مر جائے، ہمارا خون ٹھنڈا پڑ جائے، ہماری غیرت مُردہ ہو جائے، ہمارا اخلاق بیجان ہو جائے، ہم ہر قسم کی ایمانی و اخلاقی حس سے محروم ہو جائیں، ہم انگریز کی گاڑی کھینچیں اور اس بات پر فخر کریں کہ ہم انگریز کی گاڑی کھینچتے ہیں، ہم انگریز کی نقالی کو شرف سمجھیں، اس کے علم کے آگے اپنے علم کو حقیر جانیں، اس کی

تہذیب کے سامنے اپنی تہذیب سے شرمائیں، یہاں تک کہ اس کے دین کو بھی اپنے دین سے اعلیٰ و اشرف سمجھیں، گو اپنی بزدلی کی وجہ سے اس کا اعلان عام طور پر نہ کر سکیں۔

یہ نظامِ تعلیم ہے جو بغیر کسی تغیر کے ہمارے اوپر آج تک مسلط ہے۔ اس کے اندر نہ صرف یہ کہ کوئی تغیر نہیں کیا گیا ہے بلکہ میں اگر یہ کہوں کہ اس کے اندر کسی تغیر کا صحیح احساس بھی ابھی تک ہمارے کارفرماؤں کے اندر نہیں پیدا ہوا ہے تو شاید یہ کہنا بیجا نہ ہو۔ بلکہ اس سے زیادہ مایوس کن بات یہ ہے کہ یہ تغیر پیدا کرنے کے لیے جس علم و شعور کی ضرورت ہے وہ بھی مفقود نظر آتا ہے۔ اس نظام تعلیم کو اس کے سابق معیار پر چلانے کے لیے جو صلاحیت درکار ہے وہ بھی روز بروز کم ہوتی جارہی ہے اور اس کو بڑھانے یا کم از کم اس کے سابق معیار پر قائم رکھنے کی کوئی کوشش بظاہر نہیں کی جارہی ہے۔

اُفق پر ستارۂ صبح نمودار ہو چکا ہے لیکن ابھی ہمارے اربابِ بست و کشاد خراٹے لے رہے ہیں قرارداد مقاصد کی صبح صادق طلوع ہو چکی لیکن ہمارے تعلیمی ذمہ داروں کے یہاں ابھی آدھی رات ہے قوم نے ایک نئی راہ پر چلنے کے لیے اعلان رحیل کر دیا لیکن ابھی سالارانِ قافلہ کو خبر بھی نہیں کہ کوئی سفر درپیش ہے۔ قوم آزاد ہو چکی ہے اور اس کے کندھوں پر ایک آزاد قوم کی ذمہ داریاں لد چکی ہیں لیکن ہماری نئی پود کو ابھی تک یہی سکھایا جارہا ہے کہ ہمارا تو نہ کوئی ماضی ہے نہ مستقبل، ماضی اور مستقبل تو درحقیقت انگریز کا ہے۔ قوم نے ہاتھ میں قرآن اٹھا لیا اور یہ اعلان کر دیا کہ ہمیں اپنا مستقبل اسی کتاب کے بتلائے ہوئے اصولوں کے مطابق تعمیر کرنا ہے لیکن ہماری تعلیم ابھی تک لارڈ میکالے کے منصوبوں کے مطابق ہی ہوتی چلی جارہی ہے۔ تقریروں میں اعلان ہو رہا ہے کہ ہم خیر امت اور شہداء اللہ فی الارض ہیں لیکن ہماری تعلیم گاہوں میں ابھی تک وہی ہڈیاں چچوڑی جارہی ہیں جو انگریز نے ہمارے سامنے پھینکی تھیں۔

ہم اس فاسد نظامِ تعلیم کو یک قلم بدل دینا چاہتے ہیں، اور اس کو بدل کر از سر نو اس کو کتاب و سنت کی بنیادوں پر قائم کرنا چاہتے ہیں تاکہ ایک امتِ مسلمہ کی حیثیت سے ہمارے اوپر اللہ تعالیٰ

نے جو ذمہ داریاں ڈالی ہیں ہم ان ذمہ داریوں کو ادا کرنے کے لیے اپنی نئی نسل کو تیار کر سکیں اور ہماری قوم نے قرارداد مقاصد کے ذریعہ سے جس نصب العین کا اظہار کیا ہے اس نصب العین کی طرف ہم بڑھ سکیں۔

اس سے کسی کو یہ غلط فہمی ہرگز نہ ہو کہ ہم تمام سائنٹفک ترقیات اور تمام موجودہ علمی اور فلسفیانہ کوششوں پر خطِ نسخ پھیر دینا چاہتے ہیں۔ ہم تو ان ساری چیزوں کی تعلیم اس سے کہیں زیادہ اہتمام سے دینا چاہتے ہیں جس اہتمام سے اس وقت ان کی تعلیم دی جا رہی ہے۔ لیکن ہم یہ تعلیم کتاب و سنت کی روشنی میں دینا چاہتے ہیں تاکہ ان علوم سے جو فکری و نظری استعداد حاصل ہو وہ کجروی اور گمراہی نہ پیدا کرے اور ان سے جو عملی قوت و طاقت حاصل ہو وہ دنیا کے اندر فساد کا ذریعہ نہ بنے۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے نوجوان ان چیزوں کو مقلدانہ اور مرعوبانہ ذہنیت کے ساتھ نہ حاصل کریں بلکہ پوری ایمانی بصیرت اور مومنانہ فراست کے ساتھ حاصل کریں تاکہ وہ ان کے ذریعہ سے اپنی اور دنیا کی صحیح خدمت انجام دے سکیں۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ پچھلے پچاس سالوں کے اندر دنیا نے ایجادات و تحقیقات میں بڑی ترقیاں کی ہیں لیکن یہ ساری ترقیاں اصلاح و تعمیر کے بجائے فساد و تخریب کی راہ میں صرف ہوئی ہیں اور برابر ہو رہی ہیں۔ اس کی واحد وجہ یہ ہے کہ انسان اپنی ان تمام تحقیقی و اکتشافی سرگرمیوں میں اُس روشنی سے بالکل محروم رہا ہے جو انسان کو انسانیت کی راہ دکھاتی ہے۔ ہم اس راہ سے ہٹ کر ایک ایسا نظامِ تعلیم قائم کرنا چاہتے ہیں جو ایک طرف تو انسان کی قوتِ ایجاد و اکتشاف کو اور اس کی صلاحیتِ فکر و نظر کو زیادہ سے زیادہ اُبھارے، دوسری طرف اس کو وہ بصیرت بھی عطا کرے کہ وہ ان طاقتوں کو صحیح طور پہ کام میں لا سکے۔

نظامِ تعلیم کی تبدیلی کے بعد ہم اس ملک کے نظامِ تمدن و معاشرت کو بھی بدلنا چاہتے ہیں۔ ہمارے پچھلے دورِ غلامی نے جس طرح ہمارے نظامِ تعلیم کو بالکل مسخ کر دیا ہے اسی طرح ہماری معاشرتی اور تمدنی زندگی کے خط و خال بھی اس نے بگاڑ ڈالے ہیں۔ انگریزوں کے دورِ غلامی میں قدرتی طور پر یہ ناممکن ہو گیا کہ ہمارا تمدن خود اپنی فطری رفتار اور اپنے فطری تقاضوں کے مطابق بڑھ سکے۔ اس کے

اور ایک اجنبی تہذیب و تمدن کی آکاس بیل نے سوار ہو کر اس کی اپنی صلاحیتوں کو بالکل نچوڑ دیا اور اسے برگ و بار لانے کی قوت سے بالکل محروم کر دیا۔ انگریزی تہذیب کے اثرات نے ہماری تہذیب میں نہایت بدنما اور بھونڈی قسم کی ناہمواریاں پیدا کر دیں۔ ہماری معاشرت میں نہایت ناگوار قسم کے اونچ نیچ نمایاں کر دیے۔ ہمارے اندر ایک بہت بڑا طبقہ ایسا پیدا کر دیا جو تہذیب و معاشرت میں بالکل ان کا نقال بن گیا۔ تہذیب و معاشرت میں نقالی قدرتی طور پر بدقوارگی، چھچھورپن اور بھونڈا پن پیدا کرتی ہے۔ چنانچہ ہم کو نہایت شرمندگی کے ساتھ اس بات کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ ہماری تہذیب میں یہ بیماریاں بھی پیدا ہو چکی ہیں۔

ہم اپنی تہذیب کو اس آکاس بیل کے چنگل سے آزاد کرنا چاہتے ہیں تاکہ وہ اپنے فطری تقاضوں کے مطابق بڑھ سکے۔ ہم اس کے اندر سے غیر اسلامی اونچ نیچ کو ختم کرنا چاہتے ہیں تاکہ اس کے اندر صحیح اسلامی مساوات کا حسن و جمال نمایاں ہو سکے۔ ہم اس کو نقالی کے بھونڈے اثرات سے بالکل پاک کرنا چاہتے ہیں تاکہ ہماری تہذیب پر بدقوارگی اور چھچھورپن کی ذلت جو مسلط ہو گئی ہے اس سے پاک ہو کر یہ ایک شاندار ماضی رکھنے والی قوم کی تہذیب کی حیثیت سے نمایاں ہو سکے۔

یہ بے حجابی و عریانی جس کے طوفان سے آپ ہر قدم پر دوچار ہیں۔ یہ نمائش حسن اور آرائش جمال جس کی بیباکیوں سے ہر گلی میں ایک ہنگامہ بپا ہے۔ یہ زنا اور فواحش کے اڈے، یہ قحبہ خانے اور یہ شراب خانے جن سے ہر گوشہ میں آپ کو سابقہ ہے۔ یہ ہماری تہذیب کی چیزیں نہیں ہیں بلکہ یہ زیادہ تر مغربی تہذیب کی آورد ہیں۔ اور اگر ہم اس ملک میں صحیح اسلامی تہذیب و معاشرت کو لانا چاہتے ہیں تو ہمارا فرض ہے کہ ہم پہلے اس لعنت کو ختم کریں۔

ہم اپنی ماؤں اور بہنوں کو یہ بتائیں گے کہ آپ کے لیے نمونہ مغربی متبرجات کی زندگیاں نہیں ہیں بلکہ آپ کو مائی عائشہؓ اور بی بی فاطمہ زہراؓ کے نمونوں کی تقلید کرنی ہے۔ ہم اُن کے آگے موجودہ تہذیب کے شیطانی اصولوں کی جگہ اُن اصولوں کو رکھنا چاہتے ہیں جو اُن کے لیے خدا نے سورۂ نور، سورۂ احزاب اور سورۂ تحریم میں اُتارے ہیں۔ ہم اُن سے یہ کہیں گے کہ آپ نسل آدم کے بینے فتنہ نہ

بنیں بلکہ آیۂ رحمت بنیں۔ آپ کی کوکھوں سے خبیثوں و خبیثات کی بس بھری فصل نہ اُپجے بلکہ آپ کی گودوں میں طیبون و طیبات پلیں اور پروان چڑھیں۔ آپ کے دودھ سے وہ غازی پرورش پائیں جو زندگی کے باطل نقوش کو مٹائیں اور حق کے ایسے نقوش ثبت کریں جو انسانیت کے لیے رہنما ہوں۔ آپ ایسی لایعنی، ایسی ہیچ اور پوچ، ایسی پلپلی، اور ایسی بے جان نسل کو جنم نہ دیں جو ہر ایک کے پیچھے بھاگے اور ہر ایک کی صدا پر لپکے۔

ہم اپنی ماؤں اور بہنوں کو یہ بتائیں گے کہ آپ کی قدر و قیمت آپ کی بے حجابی و عریانی میں نہیں ہے بلکہ آپ کی عفت و پاکدامنی میں ہے۔ ہم اُن سے یہ کہیں گے کہ آپ کا جمال سرخی و پاوڈر کا رہینِ احسان نہیں ہے بلکہ آپ کی زینت اُن اخلاق و عادات سے ہے جو اللہ اور اس کے رسول نے آپ کو سکھائے ہیں۔ ہم اُن کو آگاہ کریں گے کہ آپ کی محبوبیت و دلربائی کا راز آپ کی ساڑیوں اور آپ کے غراروں میں نہیں ہے بلکہ اُس لباسِ تقویٰ و عفت میں ہے جو خدا کی شریعت نے آپ کو پہنایا ہے۔

ہم اپنی بہنوں کو دعوت دیں گے کہ وہ اُس پاکیزہ اسلامی تہذیب کے قائم کرنے میں ہمارا ہاتھ بٹائیں جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لے کر آئے تھے۔ یہ ہمارا اور ان کا ایک مشترک کام اور مشترک فریضہ ہے۔ شیطان کی تہذیب پھیلانے والوں اور پھیلانے والیوں کی دنیا میں کمی نہیں ہے۔ اُس کے بندے اور بندیاں ہر جگہ اپنے کام میں مشغول ہیں۔ البتہ اللہ کی تہذیب کو پھیلانے والے مردوں میں بھی کم ہیں اور عورتوں میں بھی اُن کی تعداد تھوڑی ہے۔ ہم اپنی بہنوں کو دعوت دیتے ہیں کہ وہ اس خدائی فوج میں بھرتی ہوں اور خدا کے اس کام کو انجام دے کر اس کی رضا حاصل کریں۔

ہم اس ملک کے معاشی نظام کو بھی بدلنا چاہتے ہیں۔ ہمارا موجودہ معاشی نظام ان تمام خرابیوں کا حامل ہے جو انگریزوں کی خود غرضی اس ملک کے معاشی نظام میں پھیلا سکتی تھی۔ انگریز نے اس ملک میں ایک ایسا معاشی نظام قائم کیا تھا جس کا مقصد یہ تھا کہ وہ اس ملک کے تمام فوائد کو خود سمیٹ سکے۔ اپنے اس کام میں مدد دینے کے لئے اس نے اپنے کچھ

ایجنٹ بھی رکھے اور ان کی خدماتِ ظلم کے صلہ میں اُنہیں بھی اس لُوٹ کے نظام میں کچھ فوائد پہنچائے یہ صورتِ حال ناقابلِ برداشت ہے اور اگر اس کو بزور قوت قائم رکھنے کی کوشش کی گئی جیسا کہ اس وقت کی جا رہی ہے، تو اس سے بڑے خطرناک نتائج کے پیدا ہونے کے امکانات ہیں انگریزوں نے دولت کو ایک محدود طبقہ کے اندر سمیٹ دینے کے لیے جو راہیں کھول دی ہیں ہم ان کو بالکل بند کر دینا چاہتے ہیں۔ اسلام نے دولت اور وسائلِ دولت کو زیادہ سے زیادہ پھیلا دینے کے لیے جو ضابطے بنائے ہیں ہم ان کو جاری کرنا چاہتے ہیں۔ لوگوں کی کمائی کو ناجائز طریقہ پر گھسیٹنے کے جو ہتھکنڈے ایجاد کیے گئے ہیں ہم ان سب کو بند کر دینا چاہتے ہیں۔ سوسائٹی کے معذور و کمزور اور نادار افراد کی ذمہ داری ہم ریاست پر ڈالنا چاہتے ہیں کہ وہ ان کی تمام ضروریات کی کفالت اپنا مقدم ترین فرض سمجھے۔ ایک اسلامی نظام میں ایک لمحہ کے لیے بھی یہ چیز گوارا نہیں کی جا سکتی کہ کچھ لوگ دادِ عیش دیں اور دوسرے نانِ شبینہ کے بھی محتاج ہوں، کچھ لوگوں کے لیے ترقی اور کامیابی کی غیر محدود راہیں کھلی ہوئی ہوں اور دوسرے اپنی ناداری کی وجہ سے نہ اپنا اور اپنے بیوی بچوں کا علاج کرا سکیں نہ اپنے بچوں کو ضروری تعلیم دلا سکیں۔

ہم اس ملک میں وہ معاشی نظام جاری کرنا چاہتے ہیں جو محمد رسول اللہ صلعم نے مدینہ کی اسلامی ریاست میں جاری کیا تھا۔ جس میں امیر بھی تھے اور غریب بھی، حاکم بھی تھے اور محکوم بھی، زمینوں کے مالک بھی تھے اور کاشتکار بھی، لیکن اُن کے درمیان کوئی کشمکش نہ تھی، کوئی تصادم نہ تھا، کسی کے لیے جبر و ظلم اور استحصالِ ناجائز کا کوئی امکان نہ تھا۔ غربت اس طرح اُس ریاست سے رخصت ہو گئی تھی کہ خدا کی راہ میں خرچ کرنے والے اصحابِ حیثیت ضرورت مندوں کو تلاش کرتے پھرتے تھے کہ اُن کی مدد کریں مگر کوئی طالبِ مدد محتاج ان کو نہیں ملتا تھا۔ نزاع اور تصادم کے تمام امکانات کا اس طرح خاتمہ ہو گیا تھا کہ ایک ایسے ملک میں جہاں لوگ بات بات پر لڑنے جھگڑنے کے عادی تھے، وہاں مدتیں گذر جاتی تھیں لیکن عدالتوں میں کوئی مقدمہ نہیں آتا تھا۔ محتاجوں اور ضرورت مندوں کی خبر گیری اور ان کی کفالت کا یہ اہتمام تھا کہ ایک مسلم تو درکنار ایک ذمی بھی اگر بھیک مانگتا نظر آ جاتا تو حضرت عمرؓ

م۔ بیت المال سے اس کا وظیفہ مقرر کر دیتے۔

بقیہ رُوداد اجتماع کراچی

اجتماع عام کے موقع پر یکم مارچ ۴۹ء سے ۳۰ ستمبر ۵۱ء تک کے جو حسابات پیش کیے گئے اُن کی تفصیل حسب ذیل ہے :-

تفصیل آمدنی

اعانت	۳ — ۱۵ — ۵۷۲۱۷
زکوٰۃ	۰ — ۱۱ — ۳۵۹۸۰
لقطہ	۶ — ۲ — ۱۹
متفرقات	۳ — ۷ — ۱۳۰۴
جملہ آمدنی	۰ — ۴ — ۹۴،۵۲۲
خسارہ	۳ — ۷ — ۱۵،۲۵۱
میزان کل	۳ — ۱۱ — ۱،۰۹،۷۷۳

تفصیل مصارف

معاوضہ جات کارکنانِ مرکز	۹ — ۱ — ۲۶۱۸۵
کرایہ مکانات	۶ — ۳ — ۱۱۴۰۸
دار العروبہ	۳ — ۷ — ۸۵۶۳
دفتر مشرقی پاکستان	۰ — ۱۰ — ۱۲۱۴۴
مصارف تنظیم جماعت معہ مصارف دفتر و سفر خرچ	۳ — ۲ — ۱۱۵۵۰
مصارف مہمان خانہ	۰ — ۱۲ — ۲۸۵۶
انتخابات پنجاب	۰ — ۶ — ۱۲۳۱۴
نشر و اشاعت	۰ — ۹ — ۸۷۴۹
خسارہ روزنامہ تسنیم	۰ — ۵ — ۶۶۸۳
مصارف اجتماع سالانہ ۴۹ء	۰ — ۱ — ۷۶۰۰
متفرق مصارف	۶ — ۱ — ۱۶۱۸
	۳ — ۱۱ — ۱،۰۹،۷۷۳

مورخہ ۳۰ ستمبر ۵۱ء کو جماعت کی مالی پوزیشن حسب ذیل تھی :-

موجودات - نقد بدست	۷ — ۸ — ۷۷۷۲
مرکزی مکتبہ میں سرمایہ کے طور پر	۳ — ۶ — ۸۲۷۹
قرض واجب الوصول	۹ — ۵ — ۲۸۱۴۴
دست گرداں	۹ — ۱۵ — ۲۱۷۱
میزان موجودات	۴ — ۴ — ۴۶۳۶۸
خسارہ تا حال	۲ — ۶ — ۹۱۰۲
جملہ میزان	۶ — ۱۰ — ۵۵۴۷۰

واجبات - امانات	۹ — ۷ — ۴۶،۶۵۷
قرض واجب الادا	۰ — ۰ — ۸۸۰۰
دست گرداں	۹ — ۲ — ۱۳
جملہ میزان	۶ — ۱۰ — ۵۵۴۷۰

تخمینہ آمد و خرچ از یکم اکتوبر ۵۱ء تا ۲۹ فروری ۵۲ء جو ۱۲ نومبر ۵۱ء کو ارکان کے اجتماع خصوصی میں پیش کیا گیا

متوقع آمدنی - اعانت	۴۲۰۰	متوقع مصارف معاوضہ جات کارکنان مرکز	۶۰۰۰
زکوٰۃ	۳۷۰۰	کرایہ مکانات	۲۱۵۰
وصولی قرض	۸۰۰۰	مصارف تنظیم جماعت مع مصارف دفتر و سفر خرچ	۲۳۵۰
متفرقات	۱۰۰	دار العروبہ	۱۶۵۰
مکتبہ سے واپسی سرمایہ	۴۰۰۰	نشر و اشاعت	۱۱۰۰
		مہمان خانہ	۳۰۰
		قرضوں کی ادائیگی	۸۰۰۰
		متفرقات	۳۰۰
تخمینہ آمدنی	۲۰۰۰۰	مکتبہ میں مزید سرمایہ	۵۵۰۰
متوقع کمی	۸۰۰۰	نادیدہ مصارف	۶۵۰
جملہ میزان	۲۸،۰۰۰	جملہ متوقع مصارف	۲۸،۰۰۰

تخمینہ آمد و خرچ یکم مارچ ۵۲ء تا ۲۸ فروری ۵۳ء

متوقع آمدنی - اعانت	۲۲،۴۰۰	متوقع مصارف معاوضہ جات کارکنان مرکز	۱۳۸۰۰
زکوٰۃ	۱۲،۰۰۰	کرایہ مکانات	۴۲۰۰
وصولی قرض	۷۵۰۰	مصارف تنظیم جماعت مع دفتری مصارف و سفر خرچ	۷۶۰۰
متفرقات	۵۰۰	دار العروبہ	۴۷۰۰
مکتبہ سے واپسی سرمایہ	۸،۸۰۰	مہمان خانہ	۱۵۰۰
جملہ متوقع آمدنی	۵۱۲۰۰	قرضوں اور امانتوں کی ادائیگی	۲۵۰۰۰
متوقع کمی	۹۸۰۰	متفرقات	۱۲۰۰
	۶۱،۰۰۰	نادیدہ مصارف	۳۰۰۰
		جملہ متوقع مصارف	۶۱۰۰۰

اعلان

ترجمان القرآن کے مندرجہ ذیل پرانے پرچے دفتر میں موجود ہیں ——— قیمت فی پرچہ ۱۰/

جلد	عدد	ماہ	سنہ	
۳۱	۱، ۳، ۴، ۵	شعبان رمضان شوال ذی قعدہ	۱۳۶۷	ہجری
۳۲	۱و ۲، ۳، ۴، ۵	رجب و شعبان رمضان شوال ذی الحجہ	۱۳۶۸	〃
۳۳	۱ تا ۳، ۴، ۵، ۶	محرم تا ربیع الاول ربیع الثانی جمادی الاول جمادی الثانی ۔	۱۳۶۹	〃
۳۴	۱،۲ تا ۵،۶	رجب، شعبان تا ذی قعدہ، ذی الحجہ	۱۳۶۹	〃
۳۵	۱، ۲، ۳، ۴،	محرم، صفر، ربیع الاول و ربیع الثانی،	۱۳۷۰	〃
۳۵/۳۶	۵، ۶ و ۱	جمادی الاوّل تا رجب	۱۳۷۰	〃
۳۶	۲، ۳، ۴، ۵ و ۶	شعبان، رمضان، شوال ذی قعد و ذی الحجہ	۱۳۷۰	〃
۳۷	۱، ۲	محرم و صفر	۱۳۷۱	〃

ملنے کا پتہ

دفتر ترجمان القرآن اچھرہ لاہور

اسلامی تحریک دُوسری اجتماعی تحریکوں کے مقابل میں

نعیم صدیقی

ہرچند کہ موضوع ایک علمی و تحقیقی مقالے کا متقاضی تھا اور اس پر تیاری بھی ایک مقالے کے تقاضوں کو پیش نظر رکھ کر کی جارہی تھی، لیکن بعض وجوہ سے ناگزیر تھا کہ جماعتِ اسلامی پاکستان کے سالانہ اجتماع میں اس موضوع پر تقریر ہی کی جائے۔ چنانچہ بہت سے مباحث کو بڑی شکل سے ڈیڑھ گھنٹے کی ایک تقریر میں سمویا گیا۔ وہی تقریر اب قلمبند کی جارہی ہے اور جہاں کہیں ضرورت محسوس ہوئی ہے کسی قدر اضافے کر دیئے گئے ہیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

یہ دورِ تہذیب[1] جس میں سے آج کی دنیا گذر رہی ہے تاریخِ انسانی کا سب سے نرالا دور ہے۔ یہ پہلا دورِ تاریخ ہے جس میں انسان نے سوچ سمجھ کر اپنی زندگی کو خدا کے تصور سے، اس کی ہدایت سے، اس کے قانون سے اور الہامی اخلاق کی قیود سے آزاد کر کے خالص الحاد کی بنیادوں پر اپنی سیاست، معیشت، معاشرت، علوم و فنون، تہذیب و تمدن اور بین الاقوامی تعلقات کو استوار کیا ہے۔ یہ دورِ تہذیب الحاد کے اصولوں کا ایک مکمل ہمہ گیر اور عالمگیر تجربہ ہے اور اتنا مکمل تجربہ ہے کہ آج یہ اپنے پورے نتائج ہماری آنکھوں کے

---

[1] یہ وضاحت شاید ضروری ہو کہ یہاں "دورِ تہذیب" کی اصطلاح ہیگل کے فلسفے کی مشہور اصطلاح "دورِ تاریخ" کے معنوں میں استعمال نہیں کی جارہی۔ بلکہ یہاں دورِ تہذیب کا مفہوم یہ ہے کہ ایک اجتماعی نظریۂ فکر و عمل افراد کے ذہنوں سے نکل کر قومی نظاموں کی شکل میں ڈھلا، پھر قوموں نے اسے فروغ دیا اور وہ عالمگیر پیمانے پر فروغ یافتہ ہوا اور آج حالت یہ ہے کہ دنیا کے ہر ملک کے علوم و فنون اور سیاسی و معاشی تنظیموں میں یہ سرایت کئے ہوئے ہے۔ اس طرح کسی نظریے کے پھیل جانے کو ہم "دورِ تہذیب" کا نام دیتے ہیں۔

سامنے لئے کھڑا ہے۔

مجھے اپنی گفتگو کا آغاز اس دورِ تہذیب کے تذکرے سے اس لئے کرنا پڑا ہے کہ دنیا کی جن اہم ترین بین الاقوامی اجتماعی تحریکوں اور نظاموں سے اسلامی تحریک کا تقابل کرنا مطلوب ہے ان سب کا سرچشمہ یہی دورِ تہذیب ہے۔

دورِ متوسط سے یورپ کو جو چیز دورِ جدید میں لائی وہ دل و دماغ کی وہ تبدیلی تھی جسے ہم نشأۃ ثانیہ (Renaissance.) کے نام سے جانتے ہیں۔ سیاست میں بادشاہت، معیشت میں جاگیرداری اور علم و اخلاق اور نظامِ معاشرت میں کلیسائیت کے تسلط نے زندگی کو مغربی قوموں کے لئے ایک بوجھ بنا دیا تھا۔ لیکن اس سے نجات حاصل کرنے کے لئے شعور کی جس حرکت اور جذبات کی جس کروٹ کی ضرورت تھی وہ اس وقت تک پیدا نہ ہو سکی جب تک کہ مسلم فاتحین فکر و احساس کی کچھ نئی لہریں اپنے جلو میں لئے ہوئے دنیائے مغرب میں داخل نہ ہوئے۔ یہ لوگ اپنے اصل مقام سے پسپا ہو جانے کے باوجود جس نئے نظامِ حیات کے علمبردار تھے وہ مسخ ہو کر بھی مذہبی عقائد میں تعقل، علوم و فنون میں تجربہ و تحقیق، سیاست میں ایک پاکیزہ جمہوریت اور معاشرت میں اخوت و مساوات کے گوناگوں عملی مظاہر اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ چنانچہ مسلم فاتحین اگرچہ مغرب کو اپنے نظامِ حیات کا مومن نہ بنا سکے لیکن ان کو اور ان کی تاریخ کو انہوں نے شدید طور پر متاثر کیا۔ اسلام ہی حقیقی سبب بنا ہے نشأۃِ ثانیہ کے ظہور کا، لیکن بہت سے اسباب تھے جن کے تحت تبدیلی کی یہ رَو آگے چل کر بالکل الحاد کی طرف مڑ گئی۔

نشأۃ ثانیہ کا ظہور اپنے ساتھ ایک شدید کشمکش کا پیغام لے کر آیا۔ عام انسان کے اندر بادشاہت، کلیسائیت، جاگیردار طبقے اور بورژوا طبقے کے خلاف ایک جذبۂ تنقید اور ایک ذوقِ احتجاج ابھرا تو ان طاقتوں میں سے ہر ایک اپنے نامعقول سے نامعقول حقوق اور ظالمانہ سے ظالمانہ مفاد کو دانتوں سے پکڑ کے بیٹھ گئی اور اصلاح پذیری سے ہر ایک نے انکار کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دوسری طرف مخالفت اور کشمکش کے جذبات اور بھڑک گئے۔ آہستہ آہستہ دونوں طرف انتہا پسندی پیدا ہو گئی۔ قدامت کے علمبرداروں نے ہر نئی آواز کو کچلنا ضروری سمجھا، اور جدت کے علمبرداروں نے پہلے کی ہر چیز کو توڑ پھوڑ ڈالنے کا فیصلہ

کرلیا۔ اس طرح پندرہویں سولہویں صدیوں کا دور جذباتی کشمکش اور توڑ پھوڑ کا ایک ایسا دور ہے جس میں چڑ اور ضد سے بہک کر تبدیلی کے جذبات خالص الحاد کے راستے پر پڑ گئے۔ اور اس طویل کشمکش کے بعد مغرب میں تہذیبِ الحاد کا دور شروع ہوا۔

تہذیبِ الحاد کے معماروں نے کائنات کی بدیہی شہادتوں اور انسانی فطرت کی کھلی کھلی پکار کو رد کرکے زندگی کی ساری عمارت کو اس فلسفے پر کھڑا کیا کہ یہ دنیا مادے کا کرشمہ ہے اور کسی خالق کے بنائے بغیر بنی ہے اور کسی حاکم و ناظم کے چلائے بغیر چل رہی ہے اور اس میں جو قوانین و نوامیس کارفرما ہیں وہ کسی قانون ساز کے منت کش نہیں ہیں۔ اس فلسفے کو سامنے رکھ کر جدید تہذیب کے بانیوں نے سارے ہی انسانی علوم کو خدا پرستی کی بنیادوں سے اکھیڑ کر انکارِ خدا کی بنیادوں پر استوار کرنے کی ایک لمبی مہم شروع کی۔ ہر تحقیق جس کا آغاز کیا گیا اس کی بسم اللہ اس مفروضے کو حقیقت مان کر کی گئی کہ کوئی خدا نہیں ہے، کوئی الہامی ہدایت نہیں ہے، کوئی واجب الاطاعت نظامِ اخلاق نہیں ہے، کوئی حشر و نشر نہیں ہے اور کوئی جواب دہی نہیں ہے۔ سائنس، علم النفس، بیالوجی، سیاست، اخلاق اور اجتماعیات اور دوسرے علوم پر بھی قلم اٹھایا گیا، یہ طے کرکے اٹھایا گیا کہ نظریۂ الحاد کو ایک حقیقت اور ایک امر واقعہ کی حیثیت سے منوانا ہے۔ اس طرح اس تہذیب کے لئے علمی بنیادیں فراہم کی گئیں اور پھر ان علمی بنیادوں پر اجتماعی تحریکوں اور اجتماعی نظاموں کی بنا پر رکھی گئی۔

انسان پہلے بھی حقیقت سے دور ہٹا ہے اور وہ پہلے بھی الٰہی ہدایت کی راہ سے بھٹکتا رہا ہے، مگر پوری تاریخِ انسانی میں وہ پہلی بار سوچ سمجھ کر اور بالکل علمی تیاریوں کے ساتھ اتنا بھٹکا ہے کہ اس نے قومی اور بین الاقوامی زندگی کے ہر شعبے کی تعمیر کو انکارِ خدا، انکارِ دین اور انکارِ اخلاق کی بنیادوں پر استوار کیا ہے —— اور پھر کسی ایک شہر میں نہیں، کسی ایک ملک میں نہیں، بلکہ پورے کے پورے براعظموں میں، بلکہ ساری کی ساری دنیا میں استوار کیا ہے! نظریۂ الحاد کو یہ فروغ پہلی مرتبہ حاصل ہوا ہے کہ اس کی بنیادوں پر ایک تہذیب برپا ہوئی اور وہ تہذیب بالآخر عالم گیر ہو گئی۔ اور آج وہ نظریۂ الحاد ایک دورِ تہذیب کی وسعتوں کے ساتھ ہمارے سامنے ہے جسے ہم "دورِ الحاد"

کا نام دیتے ہیں۔

تہذیبِ الحاد کے عناصرِ ترکیبی آگے چلنے سے پہلے یہ بہت ہی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس تہذیبِ الحاد اور دورِ الحاد کے عناصرِ ترکیبی پر بھی ایک نگاہ ڈال لی جائے کہ جن کے گوناگوں مفاسد ہر اس تحریک میں اپنا کام کر رہے ہیں جو اس تہذیبِ الحاد کے بطن سے نمودار ہوئی ہے۔

اس تہذیب نے فکری اور ذہنی حرکت کا جو اصول اختیار کیا ہے وہ لبرلزم ہے۔ خلاصتہً اس اصول کا مفہوم یہ ہے کہ انسان جب سوچنے کا آغاز کرے اور کسی معاملے میں رائے قائم کرنے لگے تو اسے چاہیئے کہ اپنی فکر کو ہر قسم کی پابندیوں سے، چاہے وہ مذہبی و اعتقادی ہوں یا اخلاقی و معاشرتی، پوری طرح آزاد کر لے۔ زندگی کے مسائل کو سوچتے ہوئے یہ ملحوظ رکھنا کہ مذہب نے ان مسائل میں کیا کہا ہے یا اخلاق کے تقاضے کیا ہیں، یا معاشرے نے اس کے بارے میں کیا حدود و قیود عائد کر رکھی ہیں، تاریک خیالی اور قدامت پسندی ہے جس کے ہوتے ترقی کرنا ممکن نہیں۔ اس لبرلزم کی عملی انتہا یہ تھی کہ ہر وہ چیز جو پہلے سے چلی آتی ہو وہ چاہے اپنے اندر صداقت و افادیت کے کتنے ہی پہلو رکھتی ہو اسے بہرحال رد کر دینا اور اس کے مقابلے میں کوئی نوکھی بات تراش ڈالنا ہی اصل آزاد خیالی قرار پایا۔ فکری اور ذہنی حرکت کے اس اصول نے سب سے زیادہ شدت سے جس ماخذِ ہدایت کو نشانہ بنایا وہ دین و مذہب تھا۔ چنانچہ عقل تمام انسانی پابندیوں سے آزاد ہو کر حیوانیت کی آلۂ کار بن گئی۔

تہذیبِ الحاد کا دوسرا عنصرِ ترکیبی مادّیت Materialism ہے۔ اس کا خلاصۂ مفہوم یہ ہے کہ مادّے سے ماوراء جو کچھ ہے انسان کو اس سے اور اس کو انسان سے کوئی واسطہ نہیں۔ انسان تو اپنا مقصود کسی کو اگر بنا سکتا ہے، اپنے لئے کوئی نصب العین اگر متعین کر سکتا ہے، اور اپنی جدوجہد کسی چیز پر صرف کر سکتا ہے تو وہ مادّی مفاد ہی ہو سکتا ہے۔ وہ اگر سوچ سکتا ہے تو روپے پیسے کو سوچ سکتا ہے، روٹی کپڑے کو سوچ سکتا ہے، کھیتوں اور کارخانوں کو سوچ سکتا ہے، خام پیداواروں اور مصنوعات کی منڈیوں کو سوچ سکتا ہے — اس سے آگے کوئی چیز نہیں کہ

جس پر وہ اپنا دماغ اور اپنی قوتیں صرف کرے۔ وہ اپنے فائدے اور اپنے نقصان کو اس دنیا کے بعد آنے والی کسی دنیا اور اس کے حساب کتاب کو سامنے رکھ کر اگر طے کرتا ہے تو احمق ہے۔ اسے سارے فوائد اور سارے نقصانات کا تخمینہ اسی دنیا کو سامنے رکھ کر لگانا چاہیے اور اپنے ہر عمل کا حساب یہیں وصول کرنا چاہیئے۔ اس کے لئے خیر و شر کی کسوٹی اگر کوئی ہے تو صرف یہ ہے کہ کن خیالات اور کن اعمال کی بدولت کوئی مادی فائدہ ملتا ہے یا کسی مادی نقصان سے بچنا ممکن ہے، اور کن کی بدولت کوئی مادی فائدہ ہاتھ سے جاتا ہے یا کسی مادی نقصان کو سہنا پڑتا ہے۔

مادیت کے اس تصور کا منطقی نتیجہ یہ تھا کہ اخلاق کے لئے نظریہ افادیت اختیار کرنا پڑا۔ یعنی نیکی کی تعریف یہ ٹھیری کہ ہر وہ حرکت جس سے کم سے کم تکلیف اٹھا کر زیادہ سے زیادہ آرام حاصل کیا جا سکے اور جس کے نتیجے میں کسی طرح کا محسوس مادی فائدہ اور نقد منافع حاصل ہو سکے وہ نیکی ہے اور ہر وہ بہتر سے بہتر اور پاکیزہ سے پاکیزہ انسانی خدمت کہ جس میں کوئی محسوس مادی نقصان پہنچتا ہو اور جس میں کوئی ایسی تکلیف پہنچتی ہو جو اپنے سے زائد آرام ادا نہ کرے وہ بدی ہے۔ اس طرح مادیت کے معیارِ خیر و شر اور افادیت کے بنائے اخلاق بن جانے کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ انسان کی ساری سرگرمیاں چند حیوانی خواہشات کے گرد گھوم گئیں۔

تہذیبِ الحاد کا چوتھا ترکیبی عنصر "حاکمیتِ جمہور" Sovereignty of the People کا تصور ہے جو جمہوری سیاسی انقلابات کی صورت میں بر سرِ عمل آیا۔ لبرلزم نے جب قومی اور اجتماعی پیمانے پر کام کرنا شروع کیا تو اس نے حاکمیتِ جمہور کے نظریے کی شکل اختیار کی۔ حاکمیتِ جمہور کا منشا یہ ہے کہ ایک قوم کے عوام اپنی خواہشات اور اپنی آرا میں ہر قسم کی پابندیوں سے آزاد ہیں۔ وہ جس شئے کو کثرتِ آرار سے چاہیں اپنے لئے خود حرام یا حلال ٹھیرا سکتے ہیں۔ دین اور اخلاق کا کوئی اصول ایسا نہیں جو ان کی آرار اور ان کے فیصلوں اور ان کی خواہشوں کو پرکھنے والی کسوٹی بن سکے، بلکہ جمہور کی آرار اور ان کے فیصلے اور ان کی خواہشیں وہ اصل کسوٹی ہیں کہ جسے چاہیں حق قرار دیں اور جسے چاہیں باطل ٹھیرائیں، جسے چاہیں اپنا دین بنا لیں اور جسے چاہیں رد کر دیں۔ ان کی خواہشات سے

بالاتر کوئی اقتدار نہیں ہے۔ وہ اپنے اندر آخری اتھارٹی رکھتے ہیں۔ چنانچہ حاکمیت جمہور کے اس تصور نے خواہش کی بندگی اور مادہ پرستی کے راستے بالکل ہموار کر دیے۔

سیاست کے بعد معیشت کے میدان میں تہذیبِ الحاد کو جو مزاج ملا ہے وہ صنعتی انقلاب کا منطقی نتیجہ ہے۔ صنعتی انقلاب جب آیا ہے اور معیشت جاگیر دارانہ نظام کی بنیادوں سے جب اکھڑی ہے تو عوام ایک عجیب صورتِ حالات سے دوچار ہوئے ہیں۔ ان کا حال بالکل ایسا ہو گیا کہ جیسے وہ ایک طوفانی سمندر کے حوالے کر دیے گئے ہیں اور ہر ایک اپنے لئے ہاتھ پاؤں مار رہا ہے۔ چند سبکسارانِ ساحل کو چھوڑ کر، جو اس طوفان کی تباہ کاریوں سے بے نیاز انجمن آرا رہتے، باقی لوگوں کے لئے روٹی کے چند لوالے زندگی کا اہم ترین مسئلہ بن گئے۔ اس ظالم صنعتی انقلاب نے جب بھاپ کے دیو کو مسخر کر کے اس سے مشینیں چلوائیں اور مشینوں کی کثیر پیدا آوری اور زود پیدا آوری نے جب ہاتھ سے کام کرنے والے کاریگروں کو ہزاروں کی تعداد میں بے روزگار کرنا شروع کیا تو انسان کی ساری سرگرمیوں کا محور اس کا پیٹ بن کر رہ گیا۔ پھر صنعتی انقلاب کا لایا ہوا یہ معاشی انتشار تنہا نہیں آیا بلکہ اپنے ساتھ خاندانی نظام کی تباہی کا پیغام بھی لایا۔ جب زراعت کو صنعت نے پسپا کیا تو لوگ دیہات سے اکھڑ کر شہروں میں جمع ہونے لگے، اور جب بے روزگاری نے نقلِ مقام کی ایک عام ضرورت پیدا کر دی، اور جب محنت کے پست معاوضوں نے شہری مصارف کا بوجھ اتنا بڑھا دیا کہ گھروں نے عورت کو باہر دھکیل دیا تو خاندان کے اہم ترین تہذیبی ادارے کی بنیادیں متزلزل ہو گئیں۔ اس طرح معاشی انتشار کے ساتھ جب معاشرتی انتشار کی لہریں بھی آ کے مل گئیں تو اس سیلاب نے اخلاق اور مذہبی تصورات کی چولیں ہلا ڈالیں۔ یوں صنعتی انقلاب نے انسان کو روٹی کی بساط پر انسانیت کی ہر قیمتی سے قیمتی متاع کو قربان کرنا سکھایا اور روپیہ پیسہ اور زندگی کی مادی ضروریات آخری مقصود بن کر رہ گئیں۔ پھر صنعتی انقلاب کا ایک اثر یہ بھی پڑا کہ انسان کے متعلق ایک خاص مشینی تصور فروغ پانے لگا اور اس کی عضویاتی زندگی کی طرح اس کی نفسیاتی اور اخلاقی زندگی کی بھی ایک میکنیکل تشریح کی جانے لگی اور اس تشریح کے فریم میں زندگی کی روحانی قدروں کی کوئی کھپت سرے سے

تھی ہی نہیں۔

اس طرح صنعتی انقلاب نے اس تہذیب کا مزاج بنانے میں جو حصہ ادا کیا ہے اس کے گہرے اور رگ رگ میں اترے ہوئے اثرات اس تہذیب کے ہر شعبے اور اس کی ہر تحریک میں آج بھی کارفرما ہیں۔

پھر اس تہذیبِ الحاد کا ایک بڑا عنصر حیوانی ازدواج کا فلسفہ و نظام ہے جس نے اخلاقی قدروں کی تباہی اور نظامِ تمدن کے فسادِ مزاج کی تکمیل کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ صنعتی انقلاب جب عورت کو گھر سے اغوا کر کے باہر لے آیا اور اس سے اضطراب پیدا ہوا تو ہوشیار فلسفی آگے بڑھے اور انہوں نے مساواتِ مرد و زن کا ایک من گھڑت فلسفہ پورے زور سے پھیلانا شروع کیا۔ انہوں نے تسلی دلائی کہ عورت کا اصل مقام ہی یہ ہے کہ وہ مرد کے پہلو بہ پہلو ہر کام میں مسابقت کرے اور اور معاشی حیثیت سے خود اپنے پاؤں پر کھڑی ہو جائے۔ اس کا لازمی نتیجہ جب طلاق کی کثرت، کنوارپن کی کثرت اور زنا کی کثرت کے روپ میں نمودار ہوا تو ترقی پسند فلسفہ پھر آگے بڑھا اور اس نے اطمینان دلایا کہ آزاد محبت اور صنفی انارکی تو عین تقاضائے فطرت ہے۔ یہ نکاح وغیرہ کی پابندیاں تو مصنوعی اور محض تاریخ کے تاریک ادوار کی یادگار ہیں۔ پھر جب صنفی ذواقی کے لئے بچوں کی پیدائش سے عائد ہونے والی ذمہ داریوں کا برداشت کرنا مشکل ثابت ہونے لگا تو اسی فلسفے نے آگے بڑھ کر برتھ کنٹرول کا سبق پڑھایا اور اس میں بڑی بھاری تمدنی و معاشی مصلحتیں نمایاں کر کے دکھائیں۔ لیکن اس کے بعد بھی چونکہ توالد و تناسل کا دروازہ پوری طرح بند نہ ہو سکا اور "حرام اولاد" ایک مستقل مسئلہ بن گئی تو فلسفہ پھر سامنے آیا اور اس نے "حرام اولاد" کو جائز اولاد کے برابر ثابت کرنے اور ہر قسم کی مادریت کو ایک ہی درجہ دینے کے لئے پورا زورِ استدلال صرف کر ڈالا۔ اس طرح حیوانی ازدواج کا نظریہ میدانِ عمل میں ایک ایک قدم آگے بڑھتا گیا اور سوسائٹی میں ذواقی اپنی انتہا کو پہنچ گئی۔ اس ہمہ گیر معاشرتی فساد نے انسانی اخلاق کی ساری قدروں پر بُری طرح جھاڑو پھیر دی۔

موجودہ تہذیبِ الحاد کا انتہائی زہریلا عنصر نیشلزم ہے۔ قرونِ متوسط میں یورپ کے انسان

ئے لئے کلیسا ایک قوت محرکہ کا کام دیتا تھا، لیکن جب اس کا شیرازہ درہم برہم کر دیا گیا اور دلوں اور دماغوں سے اس کی گرفت ڈھیل پڑ گئی تو ایک بڑا نازک سوال یہ نمودار ہو گیا کہ کلیسائی جوڑ کے کھل جانے کے بعد اب چھوٹی چھوٹی قوموں اور ملکوں میں بٹے ہوئے یورپ کے لئے قوتِ محرکہ کیا ہو جو اسے ترقی کی طرف بڑھنے اور مشکلات سے لڑنے پر اکساتی رہے اور جس کے نام پر اس کے جذبات میں گرمی پیدا کی جا سکے۔ اس کے جواب میں تہذیبِ الحاد نیشنلزم کی روح کو سامنے لائی۔ خدا کے انکار کے بعد انسانی زندگی میں ایک خلاء واقع ہو جاتا ہے کہ وہ آخر کس کے نام سے تحریک حاصل کرے، اور کس کے لئے جیے اور مرے۔ اس خلاء کو پُر کرنے کے لئے نیشنلزم نے فرد فرد میں یہ احساس پیدا کیا کہ تم اور تمہاری ساری سرگرمیوں کا محور قوم کا بت ہے۔ اس بت کے استھان پر تم کو اپنا سب کچھ بھینٹ چڑھانے کے لئے تیار رہنا چاہیے۔ تمہارے سارے اجتماعی عزائم، تمہارے سارے اخلاق، تمہارے سارے اونچے آئیڈیل "خداوندِ قومیت" کے تابع ہونے چاہئیں۔ تمہاری زندگی کا ہدف یہ ہونا چاہیے کہ تم اپنی کوششوں سے قوم کے خزانۂ معیشت میں، اس کے علوم و فنون کے سرچشموں میں، اسکے مقبوضات اور اس کی منڈیوں میں زیادہ سے زیادہ اضافہ کر کے رخصت ہو۔ تمہاری قوم کے لئے جو چیز مادی لحاظ سے مفید ہو وہ چاہے دین و اخلاق کے لحاظ سے کتنی ہی بڑی ظالمانہ کارروائی چاہتی ہو، اسے کر گذرو، اور تمہاری قوم کے لئے جو چیز مادی لحاظ سے مضر پڑے وہ دین و اخلاق کے لحاظ سے کتنا ہی بڑا فریضہ کیوں نہ ہو اس سے پرہیز کرو۔ تمہیں اپنی قوم کی ترقی کے لئے دوسری قوموں کی آزادی پر اگر ڈاکے ڈالنے پڑیں اور اگر دوسروں کے واضح ترین حقوق کا قتل عام کرنا پڑے، تو یہ سب کچھ کر گزرو۔ تمہارا فرض یہ ہے کہ تمہاری قوم اگر حق پر ہو تو بھی تم اس کا ساتھ دو، اور اگر وہ جھوٹ پر ہو تو بھی تم اس کے جھوٹ کا جھنڈا بلند کرنے کے لئے پوری طرح وقف رہو۔

نیشنلزم کے اس نظریہ کے اندر فساد کے جو بیج دبے ہوئے تھے وہ جب چیرہ دستیوں، وعدہ خلافیوں، کمزور آزاریوں اور جنگوں اور تصادموں اور چالبازیوں کی شکل میں اُگے اور اپنا پھل لانے لگے تو مغرب کی قوموں نے اس کے مفاسد کی روک تھام کے لئے لیگ آف نیشنز کی بنا رکھی۔ لیکن

خدا کے انکار سے جو خلاء اجتماعی زندگی میں واقع ہو گیا تھا اسے لیگ آف نیشنز پُر کرنے میں ناکام ہو گئی اور نو عمری میں ہی اسکی تجہیز و تکفین کا سامان کرنا پڑا۔ اب پھر اس خلاء کو پُر کرنے اور نیشنلزم کے مفاسد سے نجات پانے کے لئے ادارۂ اقوامِ متحدہ کو کھڑا کیا گیا ہے۔ لیکن اس کی ناکامی بھی اوّل قدم پر معلوم ہے۔

تہذیبِ الحاد کے ان سارے عناصر نے انسانیت کے اچھے احساسات اور اخلاق کی قیمتی قدروں کو تباہ کرنے میں جو حصہ لیا ہے اُس سے کچھ بڑھ چڑھ کر کام نظریۂ ارتقاء نے کیا۔ یہاں میں اس نظریے کے حیوانیاتی (Biological) پہلو پر کوئی بحث کئے بغیر اس کے دوسرے پہلو یعنی معاشرتی پہلو کا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ خالص حیوانی تصورات کی بنیادوں پر جو تہذیب مغرب میں ارتقاء کرنے لگی تھی اس کے متعلق دلوں اور ضمیروں کا اطمینان پوری طرح اس وقت تک پیدا نہیں ہؤا اور اخلاق باختگی کے جو مظاہر اس نے لوگوں کے سامنے رکھے اس پر طبیعتیں اس وقت تک ٹھکنے نہیں پائیں جب تک کہ معاشرتی ارتقاء کا نظریہ فضا میں پوری طرح پھیل نہیں گیا۔ اس نظریے نے ظلم، مکر و فریب، کشمکش، تصادم، بے حیائی، شکم پرستی اور دوسرے تمام حیوانی اوصاف کو جو چاروں طرف فروغ پا رہے تھے عقلی اور اخلاقی جواز کی سند عطا کی ہے۔ اس نظریے نے زندگی کا بنیادی فلسفہ یہ سامنے رکھا کہ کائنات، اور خود انسانی تاریخ ایک میدانِ جنگ ہے اور فطرت نے پورا نظام ایسے اصولوں پر استوار کیا ہے کہ زندگی کا تقاضا ہی جنگ اور تصادم اور کشمکش اور قوت آزمائی ہے۔ یہاں اگر قوی کسی کمزور کو پامال کر کے آگے بڑھتا ہے تو حق یہی ہے کہ وہ ایسا کرے اور یہاں اگر کوئی کمزور ظلم سہتا ہے اور قوت کے پاؤں تلے پامال ہوتا ہے تو فطرۃً وہ اِسی قابل ہے کہ اُس کے ساتھ یہ سلوک ہو۔ یہ سب کچھ مشیت کی بے رحم جبریّت کے تحت ہو رہا ہے، لہٰذا یہاں کوئی اخلاقی سوال پیدا ہی نہیں ہوتا۔ کشمکش ناگزیر ہے اور یہ بھی ناگزیر ہے کہ ترقی کرنے والا اپنی قوت کو کمزوروں کے خلاف استعمال کر کے ان سے فائدے اٹھا کر ترقی کرے۔ اس فلسفے نے صرف اتنا ہی نہیں کیا کہ فرد اور فرد کے درمیان تعاون اور ایثار اور

ہمدردی کے تعلقات کی ساری ڈوریاں کاٹ دی ہوں اور طبقوں اور طبقوں کے درمیان اس نے توافق کے امکانات کا خاتمہ کر دیا ہو، بلکہ یہی نظریہ ہے کہ جس نے سرمایہ داری اور امپیریلزم کو پاؤں رکھنے کے لئے عقلی زمین فراہم کر کے دی ہے اور یہی ہے کہ جو کمزور قوموں پر جدید طاقتور قوموں کی چیرہ دستی کو عین حق ثابت کرنے والا منطق ہے۔

تہذیبِ الحاد کی ناکامی حضرات! یہ وہ عناصر ہیں کہ جن سے دورِ حاضر کی تہذیبِ الحاد نے ترکیب پائی ہے۔ ان عناصر اور اس ترکیبِ مزاج کو سامنے رکھ کر بڑی اچھی طرح اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس قسم کی تہذیب سے انسانیت کو کیا پھل مل سکتے ہیں۔ لیکن انسان نے اس کے عناصر ترکیبی اور اس کے مزاج سے قطع نظر کر کے بالکل برعکس قسم کی امیدیں اس سے قائم کی ہیں۔ اس نے اس تہذیب کو اختیار کرتے ہوئے امن اور سکون کی جنت کے سنہرے خواب دیکھے ہیں۔ مگر آج دو تین صدیوں کے طویل تجربے کے بعد ہم دیکھتے ہیں کہ وہ سارے خواب پریشان ہو چکے ہیں۔

غور فرمائیے کہ اس تہذیب کے زیر اثر علوم و فنون کے کتنے دریا بہائے گئے ہیں، کتنا لٹریچر ہے جو پیدا کیا گیا ہے، ادب و صحافت کی دنیا میں کتنا سرمایۂ محنت ہے جو انسانیت کے سامنے پیش کیا گیا ہے، زرعی اور صنعتی پیداواروں میں کتنا بڑا اضافہ ہوا ہے، انسانی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے کتنی گوناگوں ایجادات ہیں کہ جو وجود میں آئی ہیں، فطرت کی کتنی قوتیں ہیں کہ جن کو مسخر کر لیا گیا ہے، کتنے دوررس اور ہمہ گیر وسائل ہیں کہ جن پہ انسان کو قابو حاصل ہوا ہے، پھر کتنے ہی اجتماعی نظام، کتنے ہی ادارے، حکومتوں کے کتنے ہی ڈھانچے اور ربط و تنظیم کے کتنے ہی نمونے ہیں کہ جن کو اس تہذیب نے فراہم کیا ہے۔ یہ سب کچھ گراں بہا دماغی محنتوں کا، مالی مصارف کا، جسمانی مشقتوں کا اور جانی قربانیوں کا حاصل ہے۔ اس کے لئے انسان خونی انقلابوں سے گذرا ہے، اس کے لئے اس نے لڑائیوں کا سامنا کیا ہے، اس کے لئے وہ خاک و خون میں لوٹا ہے، اس کے لئے اس نے قربانیوں کی بڑی بھاری قیمت ادا کی ہے۔

مگر آپ ساری دنیا کا، اس کی ہر قوم کا، اور ایک ایک بستی کا اور ایک ایک فرد کا جائزہ لے کر

دیکھیں تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ انسانیت آج بھی دکھی ہے، پہلے سے زیادہ دکھی ہے اور یہ سارے سروسامان اس کی گرہوں کی عقدہ کشائی نہیں کر سکے۔ اتنی پیداواریں ہیں مگر انسان پھر بھی بھوکا ہے، اتنا سامانِ دفاع ہے مگر انسان پھر بھی خوف زدہ ہے، اِتنے علوم کے سرچشمے جاری ہیں مگر انسان پھر بھی جاہل ہے، اتنے ذرائع و وسائل کام کر رہے ہیں مگر انسان پھر بھی اطمینان سے محروم ہے۔ اُس نے جس جنت کے لئے تین چار صدیوں کا جاں کاہ سفر طے کیا ہے وہ پہلے سے زیادہ ہی دور ہو گئی ہے۔

انسانی تاریخ کا جہاں یہ سب سے بڑا تجربہ اور سب سے عجیب تجربہ ہے کہ انسان نے خدا اور اس کی ہدایت سے پوری طرح آزاد ہو کر زندگی کے تمام شعبوں کو اپنی خواہشوں پر استوار کرنے کی کوشش کی ہے، وہاں یہ دنیا کا سب سے زیادہ ناکام اور سب سے زیادہ دردناک تجربہ بھی ہے۔ جس دن انسان اپنے اس سارے کارنامے کا ٹھنڈے دل سے جائزہ لیگا اس دن وہ پشیمانی سے خون کے آنسو روئے گا۔

اب میں اُن اجتماعی تحریکوں پر گفتگو کرنا چاہتا ہوں جو اس دورِ تہذیب کے سائے میں پروان چڑھی ہیں اور جن سے ہمیں سابقہ درپیش ہے۔ ان تحریکوں کے متعلق جو کچھ میں عرض کروں گا اس کے دوران میں یہ بات آپ کی نگاہوں سے اوجھل نہ ہونی چاہیئے کہ یہ ساری تحریکیں جس مادرِ تہذیب کا دودھ پی کر پلی ہیں اس کے مزاج، اس کے اوصاف، اس کے عناصر ترکیبی اور اسکی سیرت کا پورا پورا اثر اُن کی رگوں میں سرایت کئے ہوتے ہے۔ اپنی بنیادی فکر کے لحاظ سے اُن میں کوئی بڑا اختلاف نہیں ہے۔ یہ سب کی سب اُن عناصر کو ساتھ لئے ہوئے ہیں جن سے ان کی مادرِ محترم وجود میں آئی تھیں۔

۱۔ سرمایہ دارانہ جمہوریت

تہذیبِ الحاد کے بطن سے جو پہلی اجتماعی تحریک نمودار ہوئی وہ سرمایہ دارانہ جمہوریت ہے۔ بدقسمتی سے یورپ میں جب نیا دور ابھرا تو اس کی سربراہ کاری بورژوا طاقتوں کے ہاتھ

میں آ گئی ۔ بادشاہیت ، کلیسائیت اور جاگیردارانہ نظام کے خلاف ساری جنگ تو عوام نے لڑی اور اس جنگ میں ہر طبقہ یکساں شریکِ جد و جہد رہا ، مگر اس جنگ کا سارا مالِ غنیمت بورژوا طبقہ لوٹ لے گیا ۔ صنعتی انقلاب اور جمہوری انقلاب ، دونوں کے دونوں نے قربانیاں تو عوام سے وصول کیں ، لیکن ان دونوں کا پھل بورژوا طبقہ کی جھولی میں جا پڑا ۔ بورژوا طبقہ کی اس سربراہ کاری اور اجتماعی فوقیت کی وجہ سے تبدیلی نے جو شکل اختیار کی وہ تھی سرمایہ دارانہ جمہوریت !

سرمایہ دارانہ جمہوریت کی حقیقت کا جب بھی تجزیہ کیا جائے گا تو ناگزیر ہے کہ اس کے سیاسی اور معاشی دونوں پہلوؤں کو الگ الگ کر کے دیکھا جائے ۔ پس ہم پہلے اس تحریک کے سیاسی پہلو کا جائزہ لیتے ہیں

جمہوریت کا جائزہ لینے کے لئے یہ پہلے ذہن نشین کر لینا چاہیئے کہ اس نظام کا اصل جوہر کیا ہے ۔ ایک جمہوری نظام اگر اپنے اندر کوئی افادیت رکھتا ہے تو وہ صرف اس صورت میں موجود رہتی ہے جب کہ اس کا اصل جوہر محفوظ ہو ۔ جمہوریت کا اصل جوہر یہ ہے کہ ایک تو حکومت عوام کی معتمد علیہ ہو ، کار پردازانِ حکومت عوام کے حقیقی نمائندے ہوں ، جب تک رائے عام کی حمایت ان کو حاصل رہے وہ مناصب پر قائم رہیں اور جب عوام کا اعتماد وہ کھو بیٹھیں وہ فوراً سبکدوش ہو جائیں ۔ دوسرے یہ ضروری ہے کہ حکومت ، قانون ، نظم و نسق اور داخلی اور بین الاقوامی پالیسی میں کوئی چھوٹی یا بڑی تبدیلی لانے کے لئے یہ بات کافی ہو کہ رائے عام اس تبدیلی کی حمایت کر رہی ہے ۔ دوسرے لفظوں میں پر امن طریق سے ہر تبدیلی کے آنے کے لئے دروازے کھلے رہیں ۔ یہی وہ جوہر ہے کہ جس کی بنا پر جمہوریت کے علمبردار انسانیت کو اپیل کرتے ہیں ۔

یہ جوہر جب تک کسی نظام میں محفوظ ہو وہ ایک جمہوری نظام ہے اور انسانی ترقی کے لئے اس کے مفید ہونے میں کوئی کلام نہیں ہو سکتا ۔ لیکن اگر یہ جوہر کسی طریقہ سے ضائع کر دیا جائے اور نظام کی دستوری ساخت ایسی ہو ، یا اس کے عملی طریقِ کار میں ایسے خلل موجود ہوں کہ یہ جوہر کام نہ کر سکے ، تو پھر چاہے ایک نظام کا ظاہری ڈھانچہ کتنا ہی جمہوریت نما کیوں نہ ہو ، دستور میں کیسی

ہی مرعوب کن دفعات کیوں نہ موجود ہوں، اور پارلیمنٹ اور اس کے انتخابات کا ڈرامہ کتنے ہی خوشنما طریقے سے کیوں نہ کھیلا جاتا رہے، جمہوریت جمہوریت نہیں رہتی اور اس سے جن فوائد کی توقع کی جا سکتی ہے ان میں سے کوئی بھی حاصل نہیں ہو سکتا۔

یہ حقیقت ذہن نشین رکھتے ہوئے اب ہم مغرب کی اُس الحادی جمہوریت پر تنقیدی نگاہ ڈالتے ہیں جو بورژوا طبقے کی سربراہ کاری میں ایک خاص شکل کے ساتھ امریکہ، برطانیہ، فرانس اور دوسرے مغربی ممالک میں کارفرما ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ جہاں تک جمہوری نظاموں کے باہر کے ڈھانچوں کا تعلق ہے وہ بڑے مرعوب کن ہیں، لیکن ان خوشنما ڈھانچوں کے اندر کہیں بھی جمہوریت کے حقیقی جوہر کو برسرِ عمل آنے کا موقع حاصل نہیں ہے۔ حتیٰ کہ جمہوریت کے قبلوں — امریکہ و برطانیہ — میں بھی جمہوریت کا سارا ڈرامہ کھیلا جاتا ہے لیکن جمہوریت کے جوہر کو کام نہیں کرنے دیا جاتا۔

سرمایہ دارانہ جمہوریت کے مفاسد میں اپنی تقریر میں اُن مفاسد کے متعلق بہت ہی مجمل سے اشارات کروں گا جس کی وجہ سے سرمایہ دارانہ جمہوریت کا اصل جوہر جمہوریت برباد ہو کر رہ گیا ہے۔

جمہوری نظاموں میں بڑی بڑی تبدیلیاں لانے میں اوّلین اور سب سے بھاری رکاوٹ دستور کی رکاوٹ ہوتی ہے۔ کسی بھی جمہوری نظام کو اٹھا کر دیکھئے تو اس کا ابتدائیہ، اس کے اصول اور اس کی دفعات کھلی کھلی شہادتیں دیں گی کہ وہ ایک خاص طبقے کے نقطۂ نظر کا ترجمان ہے اور اس طبقے نے پوری کوشش کی ہے کہ آئندہ نسلوں کو اپنے تجویز کردہ دستور کے بنیادی اصولوں کا اچھی طرح پابند کر لیا جائے اور حتی الامکان اُن میں تبدیلی کو زیادہ سے زیادہ دشوار کر کے رکھ دے۔

پھر دوسری بڑی مشکل یہ ہے کہ رائے عام کے بنانے میں جن ذرائع و وسائل سے کام لیا جاتا ہے وہ سارے کے سارے سرمایہ دار طبقے کے ہاتھ میں ہیں۔ خصوصیت سے پریس کی طاقت جو رائے عام پر کنٹرول کرتی ہے ایک ہی طبقے کے چند گنے چنے افراد کے قابو میں ہے اور وہ اس طاقت کے ذریعے رائے عام کے بہاؤ کو اپنے طبقے کے مفاد کے خلاف کبھی جانے نہیں دیتے۔ قوم کی قوم کو چند افراد حالات کا ایک خاص رنگین عینک سے مطالعہ کراتے ہیں، ان کو ایک زاویۂ نظر دیتے

ہیں، ان کے سامنے ایک خاص طرزِ فکر کو ابھار کر لاتے ہیں اور ان کے بعض رجحانات کو خاص طور پر غیر اہم بنا کر پیچھے دھکیلتے رہتے ہیں۔ چنانچہ یہ پریس انتخابات کے زمانے میں ذہنی فضا کو اتنا مکدّر کر دیتا ہے کہ سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں کام نہیں کر سکتیں اور رائے عام کا بہاؤ خالص جذباتی ہو جاتا ہے۔ اس طرح جب ووٹروں کے فکر کے جہاز بے لنگر ہو جاتے ہیں تو پروپیگنڈے کی ہوا ان کو جدھر چاہتی ہے دھکیل کر لے جاتی ہے۔

پھر جمہوریت کا جوہر آزادیٔ انتخاب اور آزادیٔ رائے دہی کا متقاضی ہے۔ لیکن دنیا کا کوئی جمہوری نظام ایسا نہیں کہ جہاں ووٹرں کی آزادیٔ انتخاب صحیح معنوں میں کام کر سکے۔ آزادیٔ انتخاب کی جڑ تو امیدواری کا اصول اوّل قدم پر کاٹ دیتا ہے۔ چنانچہ امریکہ جیسے قبلۂ جمہوریت کا حال یہ ہے کہ وہاں کے نیگرو کو کاغذ پر تو ویسا ہی حق رائے دہی حاصل ہے جیسا ایک سفید فام باشندے کو، لیکن پچاس سال کے عرصے میں صرف ایک نیگرو کانگریس کا ممبر منتخب ہو سکا۔ پھر وہاں ووٹروں پر پول ٹیکس لگا کر ان کے حق رائے دہی کی جیب تراشی کی جاتی رہی ہے۔ ۱۸۸۹ء سے ۱۹۰۸ء تک برابر اس ٹیکس میں اضافہ ہوتا رہا ہے۔ اس قسم کی پابندیوں کا نتیجہ یہ ہے کہ ۱۹۳۶ء میں ریاست (Tennessyee) کے گورنر کا انتخاب ہوا تو ۱۲ لاکھ ووٹروں میں سے صرف ۳ لاکھ ۵۲ ہزار نے ووٹ ڈالے۔ مختلف ممالک میں عوام کے حق رائے دہی پر اس طرح کی مختلف پابندیاں عائد ہیں۔

پھر بات اتنی ہی نہیں بلکہ ووٹوں کے باقاعدے سودے ہوتے ہیں اور انتخاب کی منڈی کے بعض "ہول سیل ڈیلر" تو بہت بڑے پیمانوں پر کاروبار کرتے ہیں۔ جی ہاں پاکستان ہی میں نہیں برطانیہ

ؔ ریاست ٹینس سی کے جس انتخاب کا اوپر ذکر ہوا ہے اس میں ایک شخص "ایڈورڈ ہل کرمپ" کے متعلق یونائیٹڈ پریس کے نمائندے کا بیان یہ ہے کہ تنہا یہ شخص ریاست کی قسمت پر حکمران ہے اور ایک مرتبہ یہ اپنا ٹیلیفون اٹھا کر اپنے زیر اثر ۶۰۰۰۰ ہزار ووٹروں کے بل پر جس سے سودا چکا لے وہ ریاست کا گورنر ہو گا۔

اور امریکہ جیسے ممالک میں بھی یہ کاروبار ہوتا ہے۔ مروّت کی قیمت پر بھی ہوتا ہے، روپے کی قیمت پر بھی ہوتا ہے، اور عورتوں کے حسن و جمال کی قیمت پر بھی ہوتا ہے۔ اپنی پارٹی کے حامیوں اور ووٹروں کو امیدوار سب سے بڑا لالچ جو دیتے ہیں وہ حکومت کے انتظامی عہدوں کا لالچ اور سرکاری محکموں سے مختلف کام نکالنے کی آسانیوں کا لالچ ہوتا ہے۔ علاوہ بریں انتخابی پارٹیاں اور عام امیدوار کامیاب ہونے کے لئے عوام کے ووٹ اس قیمت پر حاصل کرتے ہیں کہ وہ برسر اقتدار آکر ان کی کچھ خواہشات پوری کریں گے — قطع نظر اس کے کہ ان خواہشات کا پورا کرنا ملک کے مجموعی مفاد کے لئے کتنا ہی مہلک کیوں نہ ہو۔

یہ انتخابی کاروبار ووٹروں کی آزادی رائے کا درحقیقت خاتمہ کر دیتا ہے۔

علاوہ بریں برطانوی نظام انتخابات کے بارے میں خود برطانوی لبرل پارٹی کا مشہور رہنما رمزے میور (Ramsay Muir) اپنی رائے دیتے ہوئے اس کو "انتہائی غیر منصفانہ، غیر اطمینان بخش اور خطرناک" قرار دیتا ہے۔ اس کا تجزیہ یہ ہے کہ اگر ووٹوں کے استعمال کی حقیقت کو دیکھا جائے کہ کتنے ووٹ اس لئے ڈالے نہیں جاتے کہ بہت سے ووٹروں کی پسند کے مطابق صحیح معیاری امیدوار موجود نہیں ہوتا، اور کتنے ووٹ ایک معیاری امیدوار کے سامنے نہ ہونے کی وجہ سے بڑی بلا کے مقابلے میں چھوٹی بلا" کے اصول پر نااہل لوگوں کو دے دیئے جاتے ہیں، اور کتنے ووٹ ناکام امیدوارں کو دیئے جانے کی وجہ سے بلحاظ نتیجہ ضائع جاتے ہیں، تو معلوم ہوگا کہ ستر فیصدی رائے دہندگان حالات پر اثر انداز ہونے سے محروم رہ جاتے ہیں اور ملک کا نظام صرف تیس فیصدی ووٹروں کی مرضی پر چلتا ہے۔ مثلاً ۱۹۴۵ء کے برطانوی انتخابات میں ۸۰ لاکھ ووٹروں میں سے ۲۵ فیصدی نے سرے سے ووٹ ہی نہیں دیئے، اور اسی طرح امریکہ کے ۱۹۴۸ء کے انتخابات میں ووٹ کا حق استعمال کرنے والے ووٹر صرف ۳۹ فیصد تھے۔

مشکل اتنی ہی نہیں، مشکل یہ بھی ہے کہ پارٹی سسٹم پر جمہوری نظام کے چلنے کی وجہ سے لوگوں کی وہ اکثریت جو نہ تو اپنے تقاضوں کے مطابق کوئی پارٹی میدان میں پاتی ہے اور نہ پارٹی بنانے

کے لئے نمایاں شخصیتیں اور صلاحیتیں اور ذرائع و وسائل رکھتی ہے، اسے مجبوراً با اثر اور نمایاں پارٹیوں کے ساتھ مصالحت کر کے اپنے آپ کو ان کے حوالے کرنا پڑتا ہے۔ اس طرح عوام کے بہت سے حقیقی رجحانات جمہوری نظاموں میں اپنے لئے کوئی راستہ ہی نہیں پا سکتے

رسائل و مسائل

از

سید ابو الاعلیٰ مودودی

یہ کتاب مولانا مودودی کے ان مضامین پر مشتمل ہے جو ترجمان القرآن میں اسی عنوان کے تحت وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہے ہیں۔ چونکہ اسلام ایک مکمل نظام زندگی ہے اور اس میں انسانی زندگی کے تمام شعبوں کے مسائل کا حل موجود ہے اس وجہ سے ان مضامین میں مولانا نے ہر طرح کے سوالات کے جوابات قرآن و حدیث کی روشنی میں نہایت مدلل اور مفصل طریق پر دیئے ہیں۔ توقع ہے کہ یہ کتاب مسلمانوں کے تمام مکاتیب خیال کے لوگوں کے لئے جاذبیت کی حامل ہوگی۔

موضوعات مندرجہ ذیل ہیں

تفسیر آیات و تاویل احادیث	(۱۶)	مسائل کے جوابات
فقہی مسائل	(۳۴)	,,
خلافیات	(۱۵)	,,
عام مسائل	(۷)	,,
معاشی مسائل	(۱۵)	,,
سیاسی مسائل	(۱۰)	,,

ضخامت ۲۸۰ صفحات قیمت مجلد مع گرد پوش پانچ روپے چار آنے

اپنے شہر کے کتب فروشوں مقامی جماعت اسلامی کے مکتبوں

یا

مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی پاکستان

اچھرہ۔ لاہور سے طلب کیجئے

تفہیمات حصہ دوم

از

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی

جس کا ایک عرصے سے انتظار تھا اب پیش کی جا رہی ہے

زمانۂ حاضرہ کے دماغوں میں اسلام کے مبادی کو مستحکم کرنے اور اسکے تقاضوں کی تکمیل کے لئے عملی روح کو بیدار کرنے کے لئے مولانا مودودی کی تالیفات کو جو اہمیت حاصل ہے، محتاج بیان نہیں۔

جماعت اسلامی کے لٹریچر نے

نہ صرف پاکستان و ہندوستان کے مسلمانوں، بلکہ پورے عالم اسلامی کے مسلمانوں کو اسلام کی عالمگیر انقلابی تحریک کے لئے بیدار اور تیار کرنے کا کام کیا ہے۔ کر رہا ہے، اور کرتا رہے گا۔ انشاءاللہ۔ یہ کتاب بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔

اس میں جن اہم اور معرکۃالارا مسائل پر
گفتگو کی گئی ہے ان میں سے چند یہ ہیں

- قرآن اپنے لانے والے کو کس رنگ میں پیش کرتا ہے
- حقیقت جن
- معنی خلافت
- فتنہ تکفیر
- قربانی پر منکرین حدیث کا حملہ
- ہیگل اور مارکس کا فلسفہ تاریخ
- ڈارون کا نظریہ ارتقا
- لباس کا مسئلہ
- غلامی کا مسئلہ
- نماز میں آلہ مکبرالصوت کا استعمال

ضخامت $(\frac{20 \times 26}{8})$ ۴۳۶ صفحات قیمت سات روپے صرف

مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی پاکستان

اچھرہ ۔ لاہور

سرورق رہبر پرنٹنگ پریس ۔ بل روڈ، لاہور میں چھپا